رسولِ کامل ﷺ

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 03-35869501

www.tanzeem.org

ترتیب

پیش لفظ 3
نبوت ورسالت اور اس کا مقصد 4
تاریخ نبوت 10
ختم نبوت اور اس کے لوازم 16
حیاتِ نبویؐ قبل از آغازِ وحی 24
مکی دور......دعوت، تربیت اور تنظیم 31
مکی دور، ابتلاء کی انتہا......اور ہجرت مدینہ 38
اندرونِ عرب انقلاب نبویؐ کی تکمیل 45
انقلابِ نبویؐ کے بین الاقوامی مرحلے کا آغاز 51
انقلاب دشمن طاقتوں کا خاتمہ......خلافتِ صدیقیؓ 58
انقلابِ نبویؐ کی توسیع......خلافتِ فاروقیؓ وعثمانیؓ 65
امت محمد ﷺ کی تاریخ کے اہم خدوخال 72
نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں اور
نبوی مشن کی تکمیل اور ہمارا فرض 79

پیش لفظ

پندرہویں صدی ہجری کے پہلے ربیع الاوّل کو پاکستان ٹیلی ویژن نے قومی نشریاتی رابطہ پر یکم تا ۱۲/ربیع الاول ۱۴۰۱ھ ''رسول کاملؐ'' کے عنوان سے بارہ روزہ پروگرام پیش کیا۔ جس میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نبوت کی اصل غرض و غایت' رسول اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے مختلف گوشوں اور خصوصیت کے ساتھ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو موضوعِ بحث بنایا۔ اور قلتِ وقت کے باوجود پندرہ پندرہ منٹ کے اندر ان موضوعات کو اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا۔

یہ بارہ تقاریر ٹیپ سے تحریری شکل میں منتقل کر کے اس عاجز نے انہیں اوّلاً قسط وار ماہنامہ ''میثاق'' کی اکتیسویں جلد (جنوری ۱۹۸۲ء تا دسمبر ۱۹۸۲ء) میں شائع کیا اور اب انہیں افادۂ عام کے لیے کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے توقع ہے کہ ''رسولِ کاملؐ'' سیرتِ مطہرہ کے اہم گوشوں پر طائرانہ نظر کے اعتبار سے بے انتہا مفید ثابت ہوگی۔

احقر
جمیل الرحمٰن عفی عنہ

نبوت و رسالت اور اس کا مقصد

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم ...... اما بعد!

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۶۵﴾ (النساء)

ناظرین کرام! آپ کو معلوم ہے کہ پندرہویں صدی ہجری کا پہلا ربیع الاوّل شروع ہو چکا ہے۔ یہ نبی اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت کا مہینہ ہے۔ اسی مناسبت سے آپؐ کے ذکر جمیل پر مشتمل گفتگوؤں کا یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں اس سے پہلے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کی سیرتِ مطہرہ کے مختلف گوشوں کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کریں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کی روشنی میں یہ سمجھیں کہ نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت کیا تھا! ہمارا ایمان ہے کہ سید ولد آدم حضرت محمد ﷺ صرف ایک نبی ہی نہیں بلکہ ''خاتم النبیین'' ہیں اور صرف ایک رسول ہی نہیں بلکہ ''آخر المرسلین'' ہیں۔ لہٰذا آپؐ کا مقصدِ بعثت یقیناً وہ بھی ہے جو تمام انبیاء اور رسل کا بنیادی اور اساسی مقصدِ بعثت ہے۔ لیکن چونکہ آپؐ پر نبوت و رسالت کا سلسلہ صرف ختم ہی نہیں ہوا بلکہ مکمل ہوا ہے لہٰذا آپؐ کے مقصدِ بعثت میں ایک تکمیلی اور اتمامی رنگ بھی ہونا ضروری ہے۔ جو آپؐ کے لیے مابہ الامتیاز اور تمام انبیاء اور رسولوں کی مقدس جماعت میں آپ کا منفرد مقام و امتیازی مرتبہ واضح ہے۔

اسلام کا پورا قصہ ایمان کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور ایمان چند ایسے ماورائی حقائق کو ماننے کا نام ہے جن تک رسائی حواسِ ظاہری کے ذریعے ممکن نہیں بلکہ جن تک رسائی کسی درجے میں صرف عقل اور وجدان کی قوتوں کو بروئے کار لا کر ہو سکتی ہے۔ اگر ان امور کو تین بڑے بڑے حصوں میں جمع کیا جائے تو وہ ایمانیات ثلاثہ کی شکل اختیار کر تے ہیں۔

یعنی ایمان باللہ یا توحید' ایمان بالآخرت یا ایمان بالمعاد اور ایمان بالرسالت اور نبوت ۔

ان تینوں کے مابین اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو بڑا گہرا منطقی ربط پایا جاتا ہے۔ تفصیلات کو چھوڑ کر اور فلسفیانہ اور متکلمانہ موشگافیوں سے قطع نظر اگر سادہ الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ ایمان کیا ہے! تو سب سے پہلے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ پوری کائنات یہ پورا سلسلہ کون و مکاں جو تاحدّ نگاہ ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ جس کی وسعتوں کا تاحال انسان کو کوئی اندازہ نہیں۔ یہ نہ ہمیشہ سے ہے نہ ہمیشہ رہے گی۔

اصطلاحاً ہم یوں کہیں گے کہ یہ حادث ہے اور فانی ہے۔ البتہ ایک ہستی ہے' ایک ذات ہے' جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ ہستی بالکل تنہا ہے اکیلی ہے لاشریک اور یکتا ہے۔ اس کی ذات اس کی صفات اس کے حقوق و اختیارات سب حد درجہ لاثانی (unique) ہیں۔ جن میں کوئی کسی اعتبار سے نہ ساجھی ہے نہ شریک ہے اس ہستی میں تمام محاسن و کمالات بتمام و کمال موجود ہیں۔ یہ ہستی ہے جسے ہم اللہ کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ہے اجمالاً ایمان اللہ یا توحید۔ اس ہستی نے اس کائنات کو پیدا فرمایا۔ یہ تخلیق بے مقصد نہیں ہے' بے کار اور عبث نہیں بلکہ بالحق (purposeful) ہے۔

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ ﴾ (آل عمران: ۱۹۰'۱۹۱)

یہ تخلیق بالحق ہے اور اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی یعنی ایک وقتِ معین تک کے لیے ہے' اسی خالق کائنات نے انسان کو تخلیق فرمایا اور انسان اس سلسلۂ تخلیق کا نقطۂ عروج ہے۔ یعنی انسان اشرف المخلوقات اور مسجودِ ملائک بنا۔ اس انسان کی ایک زندگی تو وہ ہے' جو وہ اس دنیا میں بسر کرتا ہے۔ اس دنیا میں پیدائش سے لے کر موت تک کا وقفہ۔ لیکن یہی اُس کی کل زندگی نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی ایک نہایت طویل عمل ہے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

یہ دنیا کی زندگی تو درحقیقت اس کتابِ زندگی کے صرف دیباچے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُس کی اصل کتابِ زندگی موت کے بعد کھلے گی۔ اُس کی اُخروی زندگی ہی اصل زندگی ہے جو ابدی ہے جو ہمیشہ کی زندگی ہے جس میں دوام ہے جیسے کہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ﴾ (العنکبوت)

''اصل زندگی کا گھر تو دارِ آخرت ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے''۔

انسانی زندگی کے اس طویل سفر میں موت صرف ایک وقفہ ہے بقول شاعر ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

اس طرح زندگانی دو حصوں میں منقسم ہوگئی تو اس سے جو دُنیوی زندگی کا حصہ جداگانہ متشکل ہوا اس کا مقصد ہے ابتلاء اور امتحان۔ بفحوائے آیت قرآنی:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک)

''اس نے موت اور حیات کا یہ سلسلہ اس لیے بنایا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون ہے اچھے عمل کرنے والا''

اس کو بھی علامہ اقبال نے نہایت سادہ الفاظ میں ادا فرمایا: ؎

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اس زندگی کے بعد ایک موت آنے والی ہے اُس موت کے بعد حشر و نشر ہے۔ جزا و سزا کے فیصلوں کا ایک دن ہے جسے قرآن مجید یوم الدین سے تعبیر فرماتا ہے۔ اُس دن طے ہوگا کہ انسان اپنی حیات دنیوی میں اپنی سعی و جہد کے اعتبار سے ناکام رہا یا کامیاب قرار پایا اور اس کے بعد جیسا کہ ایک خطبۂ نبوی میں الفاظ وارد ہوئے:

وَاِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا

''اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی''

پھر اُس ابدی زندگی میں یا رَوْحًا وَّرَیْحَانًا اور جَنَّةَ نَعِیْم کے مزے ہیں اور یا اللہ تعالیٰ کا عذابِ شدید اور اس کی سخت سزا ہے۔ ان تمام امور کو ماننے کا نام ایمان بالآخرہ ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالمعاد ان دونوں کے ربط سے اسلام کے تصورِ زندگی کا ایک خاکہ مکمل ہوجاتا ہے یہ گویا کہ مبدأ و معاد کا آئین ہے اس کے بغیر انسان کا حال بے لنگر کے جہاز جیسا ہے جس کی کوئی سمت متعین نہ ہو اور موجوں کے رحم وکرم پر ہو۔

سنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

لیکن اللہ اور آخرت کا یہ علم انسان کی زندگی کی ابتدا اور انتہا کا تعین کرتا ہے۔ انہی دونوں کو سمو دیا گیا ہے قرآن مجید کے ان حد درجہ جامع الفاظ میں:

﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ﴾ (البقرۃ)

''ہم اللہ ہی کے ہیں اُسی کے پاس سے آئے ہیں اور اُس کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے''۔

اب یہاں ایک سوال فطری طور پر سامنے آتا ہے۔ امتحان لیا جاتا ہے کچھ سکھا کر' جانچا اور پرکھا جاتا ہے کچھ دے کر۔ یہ جو امتحان ہے جس سے انسان اس حیاتِ دنیوی میں دوچار ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی اساس کیا ہے!! اس کی جانچ اور پرکھ کس اصول پر ہوگی!! اس سوال کا ایک جواب جو بنیادی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں اس ابتلاء و آزمائش کے لیے بھیجا تو غیر مسلح نہیں بھیجا' بہت سی صلاحیتوں اور استعداد سے مسلح کر کے بھیجا ہے بڑی پیاری آیت ہے۔ سورۃ الدھر کی:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْہِ فَجَعَلْنٰہُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا﴾

ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا تاکہ اسے آزمائیں' اسے جانچیں' اسے پرکھیں۔ پس ہم نے اسے سمیع اور بصیر بنایا اسے سماعت اور بصارت کی استعداد

دے کر دنیا میں بھیجا مزید برآں اُس میں تعقل و فکر کی صلاحیتیں رکھیں۔ اس میں نیکی اور بدی کی تمیز ودیعت کی جیسے کہ فرمایا گیا:

﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ (الشمس)

''اور قسم ہے نفس انسانی کی اور جو اسے بنایا اور سنوارا اور اُس کی نوک پلک درست کی اور اس میں نیکی اور بدی خیر اور شر کا علم الہامی طور پر ودیعت کر دیا۔''

اس سے بھی آگے بڑھ کر مزید غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قلب انسانی میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کی ایک دھیمی سی آنچ بھی رکھ دی ہے۔ ان تمام چیزوں سے مسلح ہو کر انسان اس دنیا میں آیا ہے۔ لہٰذا اُس کی اُخروی باز پرس اور اُس کا جو حساب کتاب ہوگا۔ آخرت میں اُس کی بنیادی اساس تو یہی ہے۔ گویا کہ ہر انسان مسئول ہے' ذمہ دار ہے' جواب دہ ہے۔ responsible ہے' accountable ہے' اللہ کے سامنے' خواہ کوئی نبی آئے ہوتے یا نہ آئے ہوتے' خواہ کوئی کتاب نازل ہوتی یا نازل نہ ہوتی۔ ان فطری استعدادات کی بنیاد پر جو انسان کے اندر ودیعت شدہ ہیں۔ ہر انسان مکلّف ہے' مسئول ہے' ذمہ دار ہے' جواب دہ ہے۔ لیکن اس پر رحمت خداوندی کا ایک تقاضا اور ہوا۔ انسان کے اس امتحان میں مزید آسانی پیدا کرنے کے لیے اللہ نے انزالِ وحی' انزالِ کتب' بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رُسل کا سلسلہ جاری فرمایا جو انسان کی اپنی بنیادی استعدادات کے لیے وہ سامان لے کر آئے جن سے ان کو جِلا ہو' ذہول و غفلت کے پردے اٹھ جائیں اگر آئینہ قلب پر کوئی زنگ آ گیا ہے تو دور ہو جائے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس کی مزید رحمت ہے' مزید فضل و کرم ہے۔ گویا نبوت اس پہلو سے رحمت ہے اور یہی وہ نکتہ ہے جو سمجھ لینا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ میں یہ رحمت بے پناہ وسعت پذیر ہوگئی ہے۔ اس نے تمام جہانوں کا احاطہ کرلیا ہے۔ نبوت اصلاً رحمت ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے۔ آپؐ کی رحمت تمام جہانوں پر محیط ہوگئی۔ لیکن اسی کا ایک دوسرا پہلو بھی سامنے رہے وہ یہ کہ نبیوں کی آمد' رسولوں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کے بعد اب محاسبۂ اُخروی کے لیے گویا کہ انسان پر اتمامِ حجت ہوگیا۔ انسان کے پاس اب

کوئی عذر نہ رہا' کوئی بہانہ وہ پیش نہ کر سکے گا کہ پروردگار! ہمیں معلوم نہ تھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ تیری رضا کس میں ہے۔ ہمیں علم نہیں تھا کہ تو کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے! یہ عذر اگر کسی درجے میں قابل پذیرائی ہوسکتا تھا تو نبوت و رسالت کے بعد اب اس کا امکان قطعاً ختم ہوگیا۔ اس کو آپ قطع عذر سے تعبیر کریں یا اتمامِ حجت کا نام دیں۔ بعثتِ انبیاء اور ارسالِ رُسل سے ایمان بالآخرت کے ضمن میں گویا کہ انسان کی ذمہ داری اور اُس کی مسئولیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ یہی ہے وہ بات جو اس آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوئی تھی جسے آغازِ کلام میں تلاوت کیا گیا تھا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝١٦٥﴾ (النساء)

''ہم نے اپنے ان رسولوں کو بھیجا بشارت دینے والے بنا کر اور خبردار کرنے والے بنا کر''۔

اہل حق کے لیے طالبین ہدایت کے لیے صحیح راہ پر چلنے والوں کے لیے وہ مبشر ہیں' بشارت دینے والے کہ ان کے لیے جنۃ نعیم میں نہایت روشن مستقبل منتظر ہے اور اہل زیغ کے لیے کجروی اختیار کرنے والوں کے لیے گمراہی کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے وہ خبردار کردینے والے warn کردینے والے ہیں۔

تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے مقابل' اللہ کے ہاں کوئی حجت باقی نہ رہ جائے رسولوں کے بعد وہ کوئی عذر پیش نہ کرسکیں۔ محاسبۂ اُخروی کے وقت کوئی بہانے نہ بنا سکیں۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا

اللہ زبردست ہے وہ جس طرح چاہے حساب لے اس کا اختیار مطلق ہے کوئی اسے پوچھنے والا نہیں لیکن وہ حکیم بھی ہے اس نے اپنی اس بازپرس کے لیے ایک نہایت حکمت بھرا نظام تجویز فرمایا ہے۔ اور یہی ہے وہ نظام جس کی اہم ترین کڑی ہے سلسلۂ نبوت و رسالت۔

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

تاریخ نبوت

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ﴾ (مؤمن:۷۸)

ازروئے قرآن حکیم صفحۂ ارضی پر قافلۂ انسانیت اور قافلۂ نبوت و رسالت نے ایک ساتھ سفر کا آغاز کیا۔ یعنی پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے پہلے نبی بھی تھے' اور آدم ثانی یعنی حضرت نوحؑ پہلے رسول تھے۔ اس کے بعد قافلۂ آدمیت اور قافلۂ نبوت و رسالت ساتھ ساتھ سفر جاری رکھتے رہے۔ ایک طرف مادی ارتقاء کا عمل جاری رہا' وسائل و ذرائع میں ترقی ہوتی چلی گئی انسان کے مادی علوم کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا تو ساتھ ساتھ ہدایت آسمانی' ہدایتِ خداوندی بھی ارتقائی مراحل طے کرتی چلی گئی۔ تا آنکہ نبوت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئی حضرت ابراہیمؑ کی ذاتِ مبارکہ میں اور بالآخر ختم ہوگئی اور اختتام کو پہنچ گئی محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت مقدس میں اور رسالت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی آنحضور ﷺ کی ذاتِ مبارک میں اور پھر آپؐ ہی کی شخصیت میں وہ قیامت تک کے لیے قائم و دائم ہوگئی۔

اگرچہ ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں جان سکتے کہ اس دنیا میں کل کتنے رسول آئے لیکن بطورِ اصول یہ بات قرآن مجید میں ایک سے زائد مرتبہ واضح کردی گئی کہ انبیاء و رسول صرف وہی نہیں ہیں کہ جن کا قرآن میں ذکر ہے جو آیت مبارکہ آغاز میں تلاوت کی گئی۔

یہ سورۂ مؤمن کی آیت ۷۸ کا پہلا جزو ہے اور یہی مضمون سورۃ النساء میں بھی آیا ہے۔

آغاز میں سورۂ مؤمن کی جس آیت مبارکہ کے ابتدائی حصے کی تلاوت کی گئی تھی۔

اس کا ترجمہ یہ ہے:

''(اے محمدؐ) وہ بھی رسول ہیں جن کے حالات ہم نے آپ کو بتا دیے اور ایسے

بھی بہت سے رسول ہیں کہ جن کے حالات ہم نے آپ کو نہیں بتائے‘‘۔

بعض روایات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء کی تعداد سوا لاکھ ہے۔ اُن میں سے جو رسول بھی تھے اُن کی تعداد ۳۱۳ ہے۔ نبوت و رسالت میں کیا فرق ہے! اور اُن کے مابہ الامتیاز امور کون کون سے ہیں! ان میں محققین کے نزدیک کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے لیکن ایک بات پر اجماع ہے کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص ہے یعنی ہر رسول تو لازماً نبی بھی ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ اگرچہ جو خالص فنی اصطلاحات ہیں اور اُن کے جو مباحث ہیں اُن سے ہٹ کر سادہ الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ایک ذاتی مرتبہ ہے اور رسالت ایک منصب ہے۔ جیسے کہ ہمارے ہاں ایک Cadre ہے سی ایس پی۔ لیکن پھر کسی سی ایس پی کی تقرری (appintment) ہے وہ کسی ضلع کا ڈپٹی کمشنر یا کسی وزارت میں سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوتا ہے یہ اُس کا منصب ہے جیسے کہ کسی رسول کو فائز کیا جاتا ہے۔ متعین طور پر کسی شہر یا ملک یا قوم کی طرف مبعوث فرما کر۔ قرآن مجید میں بہت سے انبیاء کا بھی ذکر ہے اور بہت سے رسولوں کا بھی ذکر ہے ان میں سے چھ رسولوں کا ذکر قرآن مجید بار بار کرتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ جن قوموں کی طرف وہ بھیجے گئے انہوں نے ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کیا اور اس کی پاداش میں اُن پر دنیا ہی میں عذاب استیصال یعنی جڑ کاٹ دینے والا عذاب نازل کیا گیا۔ ان کو نیست و نابود کر دیا گیا۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:

﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ﴾

’’پس جڑ کاٹ دی اُس قوم کی جس نے ظلم کیا‘‘۔

یعنی رسول کا انکار کرنے والی قوم کی جڑ کاٹ دی گئی اس کو نسیاً منسیاً کر دیا گیا جیسے کہ کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہو کہ اس کو آگ لگا کر ختم کر دیا جائے۔ یہ رسول جن کا ذکر بار بار آیا ہے۔ سورۃ الاعراف میں‘ سورۂ یونس میں‘ سورۂ ہود میں پھر سورۃ الشوریٰ میں‘ سورۃ المؤمنون میں اور بھی متعدد سورتوں میں۔ یہ ہیں حضرت نوح‘ حضرت ہودؑ حضرت صالح‘ حضرت لوط‘ حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہم السلام اگر ذرا غور کیا جائے تو ان میں بڑی عجیب تقسیم یہ

نظر آتی ہے کہ تین رسول حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ ماقبل سے تعلق رکھتے ہیں اور تین کو زمانہ مابعدِ حضرت ابراہیمؑ سے متعلق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے ہم عصر ہیں لیکن چونکہ ان کے بھتیجے ہیں اُن سے چھوٹے ہیں لہٰذا اس تقسیم میں انہیں حضرت ابراہیمؑ کے بعد شمار کیا جا سکتا ہے گویا کہ انبیاء اور رسل کی تاریخ میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت ایک مرکزی شخصیت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے‘ اُن کی تین نسبتیں ہیں اور تینوں نہایت بلند ہیں۔ ایک جانب وہ خلیل اللہ ہیں دوسری طرف وہ ابوالانبیاء ہیں اُن کی نسل سے سینکڑوں انبیاء اور رسول اٹھے یہاں تک کہ ہمارے رسول مقبول ﷺ بھی انہی کی نسل سے ہیں۔ پھر قرآن مجید امامۃ الناس کا منصب بھی اُن کے لیے قرار دیتا ہے۔

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ﴾ (البقرۃ)

’’اور جس وقت آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں (آزمائشوں) کے ساتھ پس پورا کیا ان کو (ابراہیم نے) (اللہ نے) فرمایا (اے ابراہیمؑ) تحقیق میں نے تجھ کو لوگوں کا امام بنایا۔‘‘

لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں‘ ابوالانبیاء ہیں اور امام الناس ہیں۔ یہ تینوں نسبتیں نہایت عظیم ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مرتبۂ نبوت کے اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ بہت بلند مقام پر فائز ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ سے پہلے تشریف لانے والے جن تین رسولوں کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے ان کے حالات کو اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے ضمن میں صرف ایک ہی جرم کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی قوموں کو ایک ہی گمراہی ہے جس پر انہوں نے نکیر کی جس پر انہوں نے روک ٹوک کی جس سے باز آنے کی انہوں نے دعوت دی اور وہ شرک کا جرم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور تمدنی‘ سماجی یا کسی اور طرح کی بے راہ روی کا ذکر نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قومِ نوح‘ قومِ ہود اور قومِ صالح کے زمانے تک ابھی انسانی تمدن اپنی ابتدائی مراحل (stages) میں تھا جس میں گمراہی بس ایک

شرک ہی کی صورت میں موجود تھی اس کے علاوہ ابھی انسانی زندگی اور اس کے متعلقات اور دوسرے پہلو ابھی کسی نہ کسی حد تک فطرت کے قریب تر واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ کی دعوت میں ایک ہی نقطہ نظر آتا ہے:

﴿یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ﴾

''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو صرف اللہ کی پرستش کرو اس کی بندگی اور پرستش میں کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ اس لیے کہ حقیقتاً اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں''۔

لیکن حضرت ابراہیمؑ کے بعد جن تین رسولوں کا ذکر آتا ہے۔ ان میں ہمیں نظر آتا ہے کہ تمدن اور تہذیب اور انسان کی حیاتِ اجتماعی کے مختلف گوشوں میں گمراہی کی وہ صورتیں ظاہر ہوئیں جو اگرچہ اُسی شجرۂ خبیثہ کے برگ و بار ہیں یعنی شرک ہی کہ یہ نتائج ہیں، لوازم ہیں لیکن یہ کہ بالفعل ان کا ظہور حضرت ابراہیمؑ کے زمانے کے بعد ہو رہا ہے چنانچہ حضرت لوطؑ کی قوم میں ہمیں جنسی بے راہ روی نظر آتی ہے۔ sexual perversion جو سماج کی جڑوں کو کھوکھلا کر دینے والی چیز ہے اس لیے کہ انسان کی معاشرت، اُس کا معاشرتی نظام درحقیقت عورت اور مرد کے تعلقات کے صحیح بنیادوں پر استوار ہونے سے ہی صحت کے ساتھ برقرار رہ سکتا ہے اس کے بعد حضرت شعیبؑ کی قوم کے بارے میں قرآن جو ذکر کرتا ہے کہ اُس میں اُن کے ہاں معاشی بے راہ روی نظر آتی ہے۔ اس قوم میں ناپ تول میں کمی ہونے لگی، دھوکہ اور فریب شروع ہو گیا۔ لوگوں کے مال ناجائز طور پر ہڑپ کیے جانے لگے، راہ زنی ہونے لگی۔ چنانچہ حضرت شعیبؑ کی دعوت قرآن مجید میں بیان ہوتی ہے تو اُس میں نہایت نمایاں پہلو یہ ہے کہ لوگو! ایک اللہ کی بندگی اور اُس کی پرستش کرو اور لوگوں کے اموال پر ڈاکہ زنی نہ کرو۔ اُن کے حقوق نہ مارو، ناپنے اور تولنے میں کمی نہ کرو۔

﴿وَیٰقَوۡمِ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ﴾

''اور میری قوم کے لوگو! پورا کرو ماپ کو اور تول کو اور انصاف کے ساتھ اور کم نہ کرو لوگوں کی چیزوں میں''۔

اس سے آگے بڑھ کر ہم دیکھتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا جا رہا ہے آلِ فرعون کی

طرف۔ اور یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ سیاسی جبر اور استبداد کی ایک بہت نمایاں مثال سامنے آتی ہے ایک قوم دوسری قوم پر اس طرح مسلط ہو گئی ہے کہ اُس نے اس کو بالفعل اپنا غلام بنا کر رکھ لیا ہے اُن سے بالجبر کام لیا جا رہا ہے اُن پر اس درجہ ظلم روا رکھا جا رہا ہے اور اُن کی اولادِ نرینہ ہلاک کر دی جاتی ہیں اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھ لیا جاتا ہے۔ یہاں حضرت موسیٰ سامنے آتے ہیں اور اس ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں:

﴿اَنۡ اَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ﴾

''اس قوم کو جسے تم نے جبر اور ظلم کے شکنجے میں کسا ہوا ہے اسے ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دو''۔

یہ تین رسول جو حضرت ابراہیمؑ کے بعد دنیا میں خاص طور پر دنیا کے اس خطے میں آئے کہ جو عرب کے آس پاس تھا جس کی تاریخ سے اہلِ عرب واقف تھے جن میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہو رہی ہے اُن کے حالات میں گویا کہ انسانی اجتماعیت جس جس پہلو سے فساد کا شکار ہو سکتی ہے ان کی نشاندہی کر دی گئی۔ اس کے بعد ایک اُمت کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ سے۔ بنی اسرائیل کی حیثیت ایک اُمتِ مسلمہ کی ہے جو کتابِ الٰہی کی حامل شریعت خداوندی کی اُمین تھی جس نے اللہ کے ساتھ ایک عہد و میثاق کیا تھا۔ اُس کی تاریخ قرآن مجید بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں پے بہ پے انبیاء آتے رہے ایک مصلح کی حیثیت سے اُن میں ایک تجدیدی کارنامہ سرانجام دیتے رہے۔ جب کبھی اُن کے اندر ایمانی جذبات سرد پڑنے شروع ہوئے یا اُن کے اعمال و اخلاق کے اندر کجی راہ پانے لگی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت و رسالت نے پھر انہیں سہارا دیا۔ اس سلسلۂ انبیاءِ بنی اسرائیل کے خاتم ہیں حضرت مسیح علیہ السلام، اس سلسلے کے آخری رسول جو گویا کہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت بن کر سامنے آئے اور اُن کے بعد چھ سو برس کا عرصہ فترتِ اولیٰ کا زمانہ کہلاتا ہے۔ جو تمہید ہے دراصل ختمِ نبوت اور اتمامِ رسالت کی۔ یہ چھ سو سال تاریخِ انسانی میں اس اعتبار سے گویا پہلی مرتبہ یہ ایک وقفہ ہے کہ جس کے دوران پورے کرۂ ارضی پر کوئی رسول اور نبی نہیں تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اب نبوت محمدی کا خورشیدِ ہدایت طلوع ہوا۔ جن پر نبوت ختم اور رسالت کی تکمیل ہوئی۔ اس فترتِ اولیٰ کا عرصہ لگ بھگ ۵۷۱ برس ہے۔ اس لیے کہ آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت سن عیسوی کے حساب سے ۵۷۱ء میں ہوئی اور آپ پر آغازِ وحی ۶۱۰ء میں ہوا۔ اس طرح یہ چھ سو سال ہیں جن کے دوران یہ فطرتِ اولیٰ ہمیں نظر آتی ہے جو تمہید ہے مستقل فترت کی کہ جس میں نبی اکرم ﷺ پر نبوت اور رسالت کا خاتمہ ہوگیا یہاں یہ بات جان لینی چاہیے کہ آنحضور ﷺ پر نبوت صرف ختم ہی نہیں ہوئی بلکہ مکمل بھی ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ختم نبوت پر تو ہمارے ہاں کافی زور ہے' اپنی جگہ یہ ایک واقعہ ہے حقیقت ہے اور اسی کی ایک قانونی اہمیت بھی ہے جس کی وجہ سے یہ مسئلہ زیادہ نمایاں ہوا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو آنحضور ﷺ کی فضیلت کی بنیاد ختم نبوت نہیں بلکہ تکمیل نبوت و رسالت ہے وہ آیۂ مبارکہ جو سورۃ المائدۃ میں ہے:

﴿اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ﴾

''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کر لیا ہے''۔

اس پر بجا طور پر یہودیوں نے بصد حسرت مسلمانوں سے کہا تھا کہ اے مسلمانو! یہ عظیم آیت جو تمہیں عطا ہوئی ہے اگر کہیں ہم پر نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس کے یومِ نزول کو اپنی سالانہ عید بنا لیتے۔

یہ ہے وہ مقام کہ جہاں نبی اکرم ﷺ رسولِ کامل کی حیثیت سے سامنے آئے' جن پر رسالت صرف ختم ہی نہیں ہوئی بلکہ مکمل ہوگئی ہے۔ جن پر نبوت کا صرف اختتام ہی نہیں ہوا بلکہ اِتمام بھی ہوا ہے۔ اس اِتمام نبوت اور اکمالِ رسالت کے مظہر کیا ہیں ان پر ان شاء اللہ بعد میں گفتگو ہوگی۔

فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

ختم نبوت اور اس کے لوازم

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا ﴿۲۸﴾﴾ (الفتح)

یہ آیۂ مبارکہ جو ابھی تلاوت کی گئی ہے سورۃ الفتح میں وارد ہوئی ہے ویسے اس کا جزوِ اعظم دو اور سورتوں میں یعنی سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصّف میں بعینہٖ انہی الفاظ میں آیا ہے:

﴿ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ ۙ﴾

تین مقامات پر ایک مضمون کا دہرایا جانا قرآن حکیم میں یقیناً ان الفاظ کی اہمیت پر دلالت کرتا ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس آیۂ مبارکہ کو پورے قرآن مجید کا عمود قرار دیا ہے یعنی یہ وہ مرکزی خیال ہے جس کے گرد قرآن حکیم کے تمام مضامین گھومتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ ذرا غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں تو یقیناً یہ الفاظِ مبارکہ ''کلید'' کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ انہی کے فہم پر دار و مدار ہے اس کا کہ ہم اس بات کو سمجھیں کہ انبیاء و رسل کی مقدس جماعت میں محمد رسول اللہ ﷺ کا امتیازی مقام کیا ہے! اس لیے کہ یہ الفاظ آنحضور ﷺ کے لیے قرآن کریم میں تین بار آئے ہیں جبکہ نہ صرف یہ کہ یہ الفاظ بعینہٖ یا اس کے قریب المفہوم الفاظ بھی کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے پورے قرآن حکیم میں کہیں وارد نہیں ہوئے۔ ذرا ان پر توجہ کو مرتکز کیجیے' ترجمہ یہ ہے:

''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول کو (ﷺ) 'الہدیٰ' کے ساتھ اور 'دین حق' دے کر تاکہ غالب کر دے اس کو پورے کے پورے دین پر اور کافی ہے اللہ بطور گواہ۔''

ان الفاظِ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان سامنے آتی ہے۔ اس

کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ اس میں آنحضور ﷺ کے لیے ’’رَسُوْلُہٗ‘‘ وارد ہوا ہے یہ لفظ جس کیفیت کے ساتھ وارد ہوا ہے اُس سے اشارہ ہوتا ہے اس بات کی طرف کہ بقیہ انبیاء ورسل کی نسبتیں اور اُن کی امتیازی حیثیات کچھ دوسری ہیں۔ مثلاً حضرت آدم صفی اللہ ہیں، حضرت نوح نجیح اللہ ہیں، حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں، حضرت اسماعیل ذبیح اللہ ہیں، حضرت موسیٰ کلیم اللہ ہیں اور حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہم السلام ہیں لیکن حضرت محمد رسول اللہ ہیں ﷺ۔ گویا کہ منصب رسالت جس مقدس ہستی پر اپنے نقطۂ عروج کو اور نقطۂ کمال کو پہنچا ہے وہ ہے ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپ سے پہلے تمام انبیاء ورسل کی بعثت صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف ہوئی۔ سب کی دعوت قرآن مجید میں نقل ہوئی ہے لیکن اُن کا خطاب ہمیشہ ایک ہی رہا:

﴿یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ط﴾

’’اے میری قوم کے لوگو! بندگی اور پرستش اختیار کرو اللہ کی جس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے‘‘۔

پس معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ سے قبل تمام انبیاء ورسل ؑ کی بعثت ان کی اپنی اپنی قوموں کی طرف ہوئی تھی۔ اس مقدس جماعت میں محمد رسول اللہ ﷺ وہ پہلے اور آخری نبی اور رسول ہیں جن کا خطاب پوری نوع انسانی سے ہے بحیثیت نوعِ انسانی۔ چنانچہ قرآن مجید میں آنحضور ﷺ کی دعوت میں بار بار الفاظ آئیں گے:

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ...... اے لوگو!

چنانچہ قرآن مجید میں جب دعوت کا آغاز ہوتا ہے تو آفاقی انداز سے ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کی پہلی آیت ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ﴾

’’اے بنی نوع انسان! اپنے اس ربّ کی بندگی اور پرستش کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے‘‘۔

خود حضور ﷺ اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرماتے ہیں یہ الفاظ آپ کے خطبے میں

وارد ہوئے جس کو نہج البلاغۃ کے مصنف نے نقل کیا ہے۔ اس کی رو سے حضور ﷺ فرماتے ہیں:

اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّاِلَی النَّاسِ کَآفَّۃً

’’اے قریش! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم‘‘

قرآن مجید میں بھی یہ مضمون آیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾

’’(اے محمدؐ) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر ونذیر بنا کر‘‘۔

اور یہی مفہوم ہے اس آیت مبارک کا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾

’’اور (اے محمدؐ!) نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر جہانوں کے لیے رحمت بنا کر‘‘۔

پس جان لیجیے کہ یہ خصوصیت صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے کہ آپ کی بعثت ہے پوری نوعِ انسانی کی جانب۔ اور یہ اصل میں اس لیے ہے کہ آپ سے پہلے واقعتاً دنیا میں Means of Communication یعنی ذرائع رسل ورسائل ایسے نہ تھے کہ کسی ایک نبی یا رسول کی دعوت پر پوری نوعِ انسانی کو جمع کیا جا سکتا۔ جو ارتقاء ہوا ہے کہ اب اُس رسالتِ کاملہ کا ظہور ہو جس کی دعوت ہو پوری نوعِ انسانی کے لیے بیک وقت اور جو مبعوث ہو اِلَی الْاَسْوَدِ وَالْاَحْمَرِ۔ تمام انسانوں کی جانب خواہ وہ افریقہ کے سیاہ فام لوگ ہوں خواہ وہ یورپ کے سرخ رو لوگ ہوں۔ خواہ وہ مشرق کے زرد رو لوگ ہوں۔ ذرا آگے چلیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی﴾

’بِالْھُدٰی‘‘ سے یہاں مراد قرآن حکیم ہے یہ پہلی چیز ہے جو حضور لے کر مبعوث ہوئے جو ہدایتِ کاملہ وتامہ ہے۔ کاملہ ہے جو ھُدًی لِّلنَّاسِ ہے۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ

ہے۔شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہے۔اس ضمن میں بھی ایک بات نوٹ فرمالیں۔ ہمارا ایمان ہے توریت بھی اللہ کی کتاب تھی، انجیل بھی اللہ کی کتاب تھی، حضرت داؤدؑ کو بھی زبور بھی اللہ ہی نے عطا فرمائی تھی بلکہ قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو بھی صحیفے عطا فرمائے گئے تھے۔ دیگر انبیاء ورسل کو بھی صحیفے دیے گئے ہوں گے لیکن یہ کہ ان میں سے کسی کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے نہیں لیا تھا۔ان میں سے بعض کتابیں تو دنیا سے ناپید ہوگئیں۔صحفِ ابراہیمؑ کا کہیں کوئی وجود نہیں اور بعض کتابیں جو موجود ہیں، ان کے بارے میں اُن کے ماننے والے بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ اپنی اصل صورت میں موجود ہیں، نہ ہی وہ اس زبان میں ہیں جن میں وہ اصلاً نازل ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کو ماننے والے خود تسلیم کرتے ہیں کہ ان کی کتابیں محرف ہیں۔لیکن قرآن مجید کی حفاظت کا اللہ نے خود ذمہ لیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں بصراحت اس کو بیان کر دیا گیا:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ﴾

''ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

تمام ائمہ اُمت اور تمام جمہور مسلمین کا اس پر اجماع ہے کہ اس آیت مبارکہ میں ''ذکر'' سے مراد 'قرآن' ہے۔خود قرآن ہی میں اس کا ایک نام ''ذکریٰ'' بھی بیان ہوا ہے۔

اس کی وجہ بھی سمجھ لیجیے۔ سابقہ کتابیں درحقیقت اسی کتاب ہدایت کے ابتدائی ایڈیشن تھے۔جس کتاب ہدایت کا آخری اور مکمل ایڈیشن ہے قرآن حکیم۔جس طرح انسان کے مادی ذرائع ووسائل نے ارتقائی مراحل طے کیے اسی طرح انسان کے ذہن اور شعور کا معاملہ بھی ارتقاء پذیر رہا۔انسان جب اپنے عقلی بلوغ کو پہنچا اپنی عقلی اور ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے پختہ (Mature) ہوا تو یہ وہ وقت تھا کہ اب اسے ہدایت کاملہ وتامہ یعنی ابدی ہدایت مکمل طور پر دے دی جائے لہٰذا اس کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی۔اس لیے کہ اس سے پہلے کی کتابیں ابدی نہ تھیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے نازل

ہی نہیں ہوئی تھیں۔اس لیے ان کی حفاظت مشیتِ الٰہی میں تھی ہی نہیں۔اگر ہوتی تو نہ یہ گم ہوتیں اور نہ ہی ان میں تحریف ہوسکتی۔ ہمیشہ کے لیے راحت آخری ہدایتِ کاملہ و تامہ وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے اس ہدایت نامے کو تا قیامِ قیامت نافذ العمل رہنا تھا لہٰذا اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے خود لیا۔ ذرا آگے چلیے۔ دوسری چیز جو حضور ﷺ لے کر آئے یا دے کر بھیجے گئے (ﷺ) وہ دین حق ہے وہ ایک نظام اجتماعی ہے۔ایک ایسا نظام عدلِ اجتماعی، جس میں سب کے حقوق وفرائض کا ایک نہایت معتدل اور متوازن نظام موجود ہے۔جس میں کوئی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرسکتا یہ وہ میزان ہے جس میں سب کے حقوق وفرائض کا تعین کر دیا گیا ہے۔اس میزان سے تول کر ملے گا جس کو جو کچھ ملے گا قسط، عدل اور انصاف سے ہر فرد کو، ہر شخص کو اس کی ناگزیر ضروریاتِ زندگی ملیں گی۔

غور کیجیے کہ ایک نظام اجتماعی اس دور کے انسان کی اصل ضرورت ہے۔ایک نظامِ عدل کی پوری نوع انسانی احتیاج رکھتی ہے۔ جہاں تک انفرادی اخلاقیات کا تعلق ہے۔ سابقہ انبیاء ورسل بھی اس لحاظ سے بہت بلندیوں تک پہنچ چکے تھے۔ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ ذاتی اخلاق کا جہاں تک تعلق ہے نجی اخلاق، اُس کے اعتبار سے حضرت مسیحؑ بھی بہت بلند مقام پر پہنچ چکے ہیں لیکن جس دور کے فاتح ہیں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اس دور میں انسانی اجتماعیت بھی ارتقائی مراحل طے کر کے اس مقام تک آچکی ہے کہ اجتماعیت کا پلہ انفرادیت پر کافی بھاری ہو چکا ہے۔انفرادیت اجتماعیت کے شکنجے میں کسی جا چکی ہے اب اجتماعیت کی گرفت انتہائی مضبوط ہے۔ اب ایک ایسے نظام اجتماعی کی ضرورت ہے جس میں انفرادی سیرت واخلاق کے ساتھ ساتھ ایک صالح معاشرہ بھی موجود ہو یعنی پوری اجتماعیت بھی صالح ہو۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ ابتداءً قبائلی نظام کے تحت قبیلہ ہی ایک مکمل اجتماعی یونٹ بن گیا تھا۔سیاسی اعتبار سے بھی سماجی اعتبار سے بھی اور معاشی اعتبار سے بھی۔ پھر ذرا انسان نے ترقی کی۔تمدن نے ارتقاء کا مرحلہ طے کیا تو شہری ریاستیں قائم ہوئیں۔اس کے بعد انسان نے اور قدم آگے بڑھایا تو بڑی بڑی

بادشاہتیں (Empires)، بڑی بڑی مملکتیں قائم ہوئیں اور بڑی سلطنتوں کا دور آیا۔ یہ وہ دور ہے۔ جب محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو رہی ہے۔ آپؐ وہ نظام لے کر آئے جو انسانوں کے مابین عدل اور قسط کی ضمانت ہے۔ جس میں کوئی طبقہ دوسرے کے حقوق پر دست درازی نہ کر رہا ہو جس میں نہ فرد جماعت کے بوجھ تلے سسک رہا ہو، نہ جماعت اور اُس کے تقاضے انفرادیت پسندی کے بھینٹ چڑھ گئے ہوں۔ ایسا نظام عدل و قسط صرف دین حق ہے۔ جو خالق کائنات کی جانب واسطہ اپنے آخری رسولؐ نوعِ انسانی کو دیا گیا۔ اسی کو قرآن ''دین الحق'' کہتا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ بہتر نظام نہایت عادلانہ نظام نہایت منصفانہ نظام اگر کسی کتاب کی زینت ہو، کسی کتاب کے اوراق میں لکھا ہوا موجود ہو تو وہ نوعِ انسانی کے لیے حجت اور دلیل نہیں بن سکتا۔ حجت اور دلیل اور قاطع عذر وہ حقیقی معنوں میں اس وقت تک نہیں بن سکتا۔ جب تک کہ اس کو قائم کر کے اور چلا کر دکھا نہ دیا جائے اور اس دین حق کی برکات وحسنات کا انسان عملی طور پر تجربہ نہ کر لے۔

آپ کے علم میں ہے افلاطون نے بھی ایک بہت اعلیٰ کتاب لکھی Republic جس میں اُس نے نظری اعتبار سے بہت عمدہ نظام تجویز کیا لیکن یہ پوری دنیا کو معلوم ہے کہ وہ نظام کبھی ایک دن کے لیے بھی دنیا میں کسی ایک مقام پر بھی قائم نہیں ہوا چنانچہ اس کی حیثیت Utopia کی ہے۔ وہ ایک خیالی جنت ہے وہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو ناممکن العمل ہے اس کے برعکس محمد رسول اللہ ﷺ جو نظام لے کر آئے وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہے۔ وہ ایک طرف اخلاقی تعلیم کا حسین ترین مرقع ہے تو دوسری طرف اجتماعی زندگی سے متعلق نہایت اعلیٰ و ارفع معتدل ومتوازن اور منصفانہ نظام کا حامل ہے۔

سورۃ الشوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان کرایا:

﴿قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾

''اے نبیؐ! کہہ دیجیے کہ میں اس کتاب پر ایمان لایا جو اللہ نے نازل کی ہے اور

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مابین نظامِ عدل قائم کروں۔''

اس آیت کی رو سے آپؐ کا مقصد بعثت یہ قرار پایا کہ آپؐ اس نظامِ عدل وقسط کو پورے کے پورے نظامِ زندگی پر غالب کریں، قائم کریں، نافذ کریں جو اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا چنانچہ دین حق کے غلبے کے لیے ایک عظیم انقلابی جدوجہد ہے، جو ہمیں سیرت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں نظر آتی ہے ایک مکمل انقلاب۔ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ ہے جو ہمیں آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے ۲۳ برس میں نظر آتا ہے۔ آغازِ وحی کے بعد بلکہ صحیح تر شمسی سال و ماہ کے لحاظ سے ساڑھے اکیس برس کے دوران نظر آتا ہے۔ چنانچہ آپ نے ان مختصر سالوں میں ایک عظیم انقلاب برپا کیا اور اُس دین حق کو عملاً دنیا میں نافذ کر کے اُس کا ایک نمونہ نوعِ انسانی کے لیے پیش کر دیا۔

چوتھی چیز جو بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اس جدوجہد میں ہم دیکھیں گے کہ قدم قدم پر مسکلات ہیں، مصائب ہیں، موانع ہیں۔ یہ جدوجہد نبی اکرم ﷺ نے خالص انسانی سطح پر کر کے دکھائی ہے۔ آپؐ نے وہ ساری تکلیفیں جھیلی ہیں جو کسی بھی انقلابی جدوجہد میں کسی بھی داعی انقلاب کو اور انقلابی کارکنوں کو جھیلنی پڑتی ہیں وہ تمام شدائد، وہ تمام موانع وہ تمام مشکلات وہ تمام آزمائشیں وہ تمام تکالیف اور مصائب جو جھیلنی پڑتی ہیں کسی بھی انقلاب کے علمبرداروں کو اور کسی بھی انقلاب کے کارکنوں کو وہ محمد رسول اللہ ﷺ نے بنفس نفیس جھیلی ہیں۔ اس کا بھی ایک سبب ہے جس کو جان لینا چاہیے۔ یہ انقلاب صرف عرب کے لیے نہیں تھا۔ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے تھا یہ پورے عالمِ ارضی کے لیے تھا محمد رسول اللہ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اُس کی تکمیل فرما دی اور اُس کے بعد عالمی سطح پر اس کی تکمیل کا فریضۂ اُمت کے حوالے کر کے آپؐ نے اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى کہتے ہوئے رفیق اعلیٰ جل شانہ کی طرف مراجعت اختیار فرمائی اب ظاہر ہے کہ بعد میں اس انقلاب کی تکمیل جن لوگوں کو کرنی تھی انہیں خالص انسانی اور بشری سطح پر اس فرضِ منصبی کو ادا کرنا تھا لہٰذا محمد رسول اللہ ﷺ جن کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ آپ محبوب رب العالمین ہیں اور اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ علیٰ کل

شی ء قدیر ہے۔ وہ چاہتا تو اپنے محبوب کے پاؤں میں کانٹا تک چبھنے نہ دیتا اور آپ ؐ کا فرضِ منصبی بھی مکمل ہو جاتا۔ لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہوا آنحضور ﷺ نے ساری مصیبتیں جھیل کر ساری تکلیفیں برداشت کر کے دین کو بالفعل قائم و نافذ فرما کر اُمت پر ہمیشہ کے لیے ایک حجت قائم کردی ہے کہ اللہ کے اس دینِ حق کو اب اُمت نے غالب اور نافذ کرنا ہے اور اس راہ کی تمام مصیبتیں جھیل کر تمام قربانیاں دے کر تمام مشکلات سے عہد برآ ہو کر اب یہی کام اُمت نے کرنا ہے۔ مسلمانوں نے اب یہ فرض انجام دینا ہے۔ جب محبوب ربّ العالمین سرورِ دو عالمؐ نے مصیبتیں اٹھا کر خالص انسانی سطح پر یہ کام انجام دیا ہے تو مسلمانوں کو بھی اس کے لیے تیار رہنا ضروری ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے جو اپنی جگہ صد فیصد درست ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں تمام انبیاء و رسل کے اوصاف اور محاسن جمع ہیں:

حسنِ یوسفؑ دمِ عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

لیکن ساتھ ہی وہ بات بھی پیش نظر رہے جو آنحضور ﷺ نے فرمائی کہ تمام نبیوں اور رسولوں نے جتنی تکلیفیں برداشت کیں میں نے تنہا وہ سب کی سب برداشت کی ہیں۔

فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

حیاتِ نبوی ﷺ قبل از آغازِ وحی

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝۸﴾ (الضحی)

انبیاء و رسل کے عمومی مقصد بعثت اور تاریخ نبوت و رسالت اور نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان کے بارے میں اجمالی گفتگو کے بعد اب آیئے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف ادوار پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے آپ ؐ کی حیاتِ طیبہ کا وہ دور جو پیدائش سے لے کر آغازِ وحی تک ہے اُس کے بارے میں واقعہ یہ ہے کہ ہمارے پاس مستند اور مصدقہ معلومات بہت کم ہیں۔ البتہ اس ضمن میں اگر قرآن مجید کی طرف رجوع کیا جائے اور سورۃ والضحیٰ کی تین آیات کو اپنے ذہن میں عنوانات کے طور پر تجویز کر لیا جائے جن کی میں نے آج کی گفتگو کے آغاز میں تلاوت کی ہے تو حیاتِ طیبہ قبل از آغاز وحی کے بارے میں جو بھی باتیں مصدقہ معلومات کی بنیاد ہمارے پاس ہیں وہ تمام باتیں اور معلومات ان تین آیات کے ذیل میں بڑی خوبی کے ساتھ انہی کی شرح و تفسیر کی حیثیت سے تین عنوانات کے بطور شامل ہو جائیں گی۔

جہاں تک آپ ؐ کی ولادت باسعادت کی تاریخ کا تعلق ہے محتاط ترین اندازوں کے مطابق آپ ؐ ۹/ربیع الاول عام الفیل کو پیدا ہوئے جو انگریزی تقویم کے مطابق اغلباً ۲۰/اپریل ۵۷۱ بنتی ہے یہاں سے آپ ؐ کی حیاتِ طیبہ کا ابتدائی دور شروع ہوتا ہے جو دراصل ﴿اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝۶ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۝۷ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی ۝۸﴾ کی مکمل تفسیر ہے۔

آپ ؐ اس دنیا میں تشریف لائے تو اس حال میں کہ والد ماجد عبداللہ کا انتقال آپ

کی ولادتِ باسعادت سے قبل ہی ہو چکا تھا چھ سال تک والدہ ماجدہ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُن کا سایہ بھی آپؐ سے اٹھالیا۔ نتیجتاً آپؐ اپنے دادا عبدالمطلب کے زیر کفالت اور زیر تربیت آئے لیکن دو ہی سال بعد یتیمی کا ایک اور داغ آپؐ کو دیکھنا پڑا اور انتہائی محبت اور شفقت کرنے والے دادا کی شفقت و محبت کا سایہ بھی آپؐ سے اٹھالیا گیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک آپؐ اپنے بڑے تایا زبیر بن عبدالمطلب کے زیر کفالت رہے۔ اور پھر اپنے دوسرے تایا ابوطالب کے زیرسرپرستی آپؐ نے اس حیاتِ دنیوی کی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ آپؐ نے ابتدائی دور میں شبانی (گلہ بانی) کا وہ فریضہ بھی سرانجام دیا ہے جو غالباً تمام انبیاء ورسل کا ایک مشترک وصف رہا ہے۔ جس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے نہایت خوبصورتی سے کہا ہے۔

اگر کوئی شعیب آئے میسر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

آپؐ نے گلہ بانی کی اور یہ بات جان لینی چاہیے کہ عرب کے لق ودق صحرا میں، ایک ایسی فضا میں کہ جہاں دور دور تک کوئی متنفس نظر نہ آتا ہو۔ اوپر آسمان کا سایہ، نیچے پھیلی ہوئی زمین، اِدھر اُدھر پہاڑ۔ یہ درحقیقت فطرت سے قریب ترین ہونے کی ایک کیفیت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنا ابتدائی دور اس کیفیت میں بسر کیا ہے گویا کہ کتابِ فطرت کا مطالعہ دل کھول کر کیا جس کی طرف ایک اشارہ ہے قرآن مجید کے آخری پارے کی سورۂ مبارکہ میں:

﴿اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ﴿١٧﴾ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ﴿١٨﴾
وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ﴿١٩﴾ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ﴿٢٠﴾﴾ (الغاشیة)

''کیا یہ دیکھتے نہیں اُونٹ کی تخلیق کو! اس میں کیسی کیسی نشانیاں مضمر ہیں اللہ کی حکمت اور قدرت کی انہیں اندازہ نہیں کہ آسمان کی رفعت کیا اشارے کر رہی ہے! کیا پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جما دیے گئے ہیں! کیا یہ غور نہیں کرتے کہ زمین کی وسعت کس بات کی گواہی دے رہی ہے!''

یہ ہے وہ کتابِ فطرت جس کے مطالعے سے انسان اپنے فاطر کے قریب ترین آتا ہے۔ اور اُس کے بھرپور مواقع میسر آئے محمد رسول اللہ ﷺ کو بالکل ابتدائی زندگی میں۔

اس کے بعد آپؐ نے کاروبار شروع فرمایا یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ نے کسی خانقاہ میں تربیت حاصل نہیں کی، کسی گوشے میں بیٹھ کر کوئی نفسیاتی ریاضتیں کر کے تزکیۂ نفس نہیں کیا۔ آپؐ زندگی کے عین منجدھار میں رہے۔ آپؐ نے بھرپور زندگی بسر کی۔ آپؐ نے اپنے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر کاروبار کیا اور اس کاروبار میں آپؐ کے اخلاق، آپؐ کی سیرت و کردار کا لوہا ہے جو لوگوں نے تسلیم کیا۔ آپؐ کے حسنِ معاملہ اور دیانت وامانت کی وجہ سے آپؐ کو ''الصادق'' اور ''الامین'' کا خطاب آپؐ کے معاشرے نے دیا۔ تو یہ خطابات ایسے ہی نہیں مل گئے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ آپؐ کے کردار کا لوہا لوگوں نے اگر واقعتاً مانا ہے تو اپنے تجربات کی بنیاد پر مانا ہے۔ سنن ابی داؤد میں ایک صحابی ایک واقعہ بیان کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آغازِ وحی سے قبل کسی کاروباری معاملہ میں میری اور محمدؐ کی کچھ گفتگو ہو رہی تھی اچانک مجھے کوئی کام یاد آیا۔ اور میں حضور ﷺ سے اجازت لے کر چلا گیا کہ ذرا آپ انتظار فرمائیں۔ میں ابھی آیا حضور ﷺ نے وعدہ فرمالیا کہ اچھا میں یہیں تمہارا انتظار کروں گا۔ میں کہیں گیا اور جا کر کچھ ایسا مصروفیات میں گم ہوا کہ مجھے اپنے وعدہ یاد ہی نہ رہا۔ تین دن بعد اچانک یہ خیال آیا کہ میں نے تو محمدؐ سے وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ میں گھبرایا ہوا اُس جگہ پر پہنچا تو میں نے یہ دیکھا کہ محمدؐ وہیں مقیم ہیں۔ آپؐ نے مجھے کوئی ملامت نہ کی، فرمایا تو صرف اس قدر کہ بہرحال میں اپنے وعدے سے پابند ہو گیا تھا کہ یہیں تمہارا انتظار کرتا۔ یہ واقعہ ایسا واقعہ ہے کہ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ کس قسم کا تجربہ ہوا تھا اہل مکہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کا۔

یہ آپؐ کا اخلاق و کردار تھا، جس کی وجہ سے آپؐ ان کی آنکھوں کا تارا بنے۔ آپؐ کو انہوں نے ''الصادق'' اور ''الامین'' کا خطاب دیا۔ آپؐ کی جوانی کے دور کے چند اور واقعات میں سے جنگ فجار میں آپؐ کی شمولیت ہے آپؐ کے تایا زبیر بن

عبدالمطلب بنی ہاشم کے علمبردار تھے اور آپؐ بھی اُن کے پہلو بہ پہلو اس جنگ میں شریک ہوئے اس لیے کہ قریش اس جنگ میں حق پر تھے۔اگرچہ اس کی صراحت ملتی ہے کہ آنحضورﷺ نے کسی کا خون نہیں بہایا۔اس لیے کہ صرف قومی یا خاندانی معاملات کے لیے کسی انسانی جان کا لینا' یہ محمد رسول اللہ ﷺ کے شایانِ شان نہ تھا۔اس جنگ کے بعد قریش کے کچھ نوجوانوں نے ایک عہد کیا جسے ''حلف الفضول'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔انہوں نے باہمی معاہدہ کیا کہ وہ ظالم کی مخالفت کریں گے مظلوم کی حمایت کریں گے۔حق اور صداقت کے راستے کی تلقین کریں گے آنحضورﷺ بھی اس حلف میں شریک ہوئے اور آپؐ بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ آج بھی اگر اُس قسم کے کسی معاہدے کی طرف مجھے دعوت دی جائے تو مَیں اس پر لبیک کہوں گا۔

خانہ کعبہ کی تعمیر کے موقع پر بھی آپؐ کے تدبر اور فراست کا ایک بہت ہی نادر نمونہ سامنے آیا۔الغرض یہ جو آپؐ کی زندگی کا دور ہے اسی میں ہمیں وہ مظہر نظر آتے ہیں جن کی طرف اشارہ ملتا ہے قرآن مجید سورۂ 'نون' میں جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾

''اور (اے محمدؐ) بلاشبہ آپؐ اخلاق حسنہ کی بلندیوں پر فائز ہیں''۔

اسی کاروبار کے ضمن میں آنحضورﷺ کا تعلق یا آپؐ کا معاملہ حضرت خدیجہؓ سے ہوا۔ان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ ایک طرف یہ عرب کی متمول ترین خاتون تھیں۔ چنانچہ روایات میں اس کی صراحت ملتی ہے کہ جب قریش کے قافلے سامانِ تجارت لے کر جاتے تھے تو تنہا انؓ کا سامانِ تجارت باقی تمام لوگوں کے مجموعی سامان سے زیادہ ہوتا تھا۔ پھر دوسری طرف اُنؓ کی عفت وعصمت پاکدامنی کا عالم یہ تھا کہ عرب کے اس معاشرے میں اُنؓ کو ''الطاھرہ'' کا خطاب دیا گیا۔یہ گویا کہ بالکل ایک فطری اور قرین عقل اور قرین قیاس بات ہے کہ یہ قِرَانُ السَّعْدَین ہوتا اور ''الصادق'' اور ''الامین'' کا نکاح ''الطاھرہ'' سے ہوتا۔مشیت الٰہی میں یہی طے تھا۔بہرحال حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے نکاح کی صورت میں وہ بات سامنے آتی ہے جو سورۃ والضحیٰ

میں ان الفاظ میں وارد ہوئی:

﴿وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝٨﴾

''(اے محمدؐ) اور پایا آپؐ کو تنگ دست پس (آپؐ کو) غنی کر دیا''۔

جہاں تک قلبِ محمدی کا تعلق ہے وہ تو ہمیشہ غنی تھا لیکن ظاہری اور دنیوی اعتبار سے جسے ہم تنگ دستی کہتے ہیں اُس کی اگر کوئی کیفیت نبی اکرمﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اب تک رہی بھی تھی تو اب جبکہ مکہ کی متمول ترین خاتونؓ آپ کے حبالۂ عقد میں تھیں' جو انتہائی جاں نثار اور اپنا سب کچھ نچھاور کر دینے والی بیوی تھیں اس کے بعد اس دنیوی احتیاج یا کمزوری کا بھی کوئی معاملہ باقی نہ رہا۔

حضورﷺ کی زندگی کا یہ دور ایک بھرپور انسانی زندگی کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ایک محبت کرنے والی جاں نثار اور وفادار بیوی رفیقِ حیات ہیں۔اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان زوجہ محترمہ سے اولاد بھی عطا فرمائی۔ایک انتہائی باعزت اور با فراغت زندگی آپؐ بسر فرما رہے تھے۔لیکن اب آپؐ کے اندر ایک داعیہ ابھرا اور توجہ کائنات اور خالق کائنات اور عالمِ بالا کی طرف مبذول و منعطف ہوئی۔اب غور وفکر کا مادہ کسی اور رخ پر پروان چڑھنا شروع ہوا۔ چنانچہ وہ روایت ہمیں ملتی ہے جس کی راویہ ہیں اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور بخاری شریف میں یہ روایت پہلے ہی باب میں موجود ہے کہ جب آپؐ کی عمر شریف چالیس برس کے لگ بھگ ہوئی۔ آپ کو خلوت گزینی محبوب ہوگئی اور آپؐ غارِ حرا میں خلوت گزینی اختیار فرماتے تھے:

حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُوْا بِغَارِ حِرَاء۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ غارِ حرا میں آپؐ عبادت کرتے تھے۔اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ عبادت کس قسم کی تھی! آپؐ کسی سابقہ اُمت میں نہ تھے کسی نبی کے پیرو نہ تھے۔کوئی عبادت کا طریقہ ایسا نہیں تھا کہ جو آپ کو کسی اور نبی کی پیروی یا کسی اور اُمت میں ہونے کی وجہ سے معلوم ہوتا اور حضرت جبرئیل سے ابھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔تو یہ عبادت کیسی تھی! اس کا جواب شارحینِ حدیث نے یہ دیا ہے کہ:

كَانَ صِفَةُ تَعَبُّدِهٖ فِیْ غَارِ حِرَاءِ التَّفَكُّرُ وَالْاِعْتِبَارُ

یعنی غارِ حرا میں آپ ؐ کی عبادت غور وفکر اور عبرت پذیری پر مشتمل تھی۔ سوچ بچار کتابِ فطرت کا مطالعہ خود اپنی فطرت کی گہرائیوں میں غواصی اور نگاہِ عبرت سے ماحول کا جائزہ وتجزیہ۔ یہ تھی آپ ؐ کی غارِ حرا میں عبادت بقول علامہ اقبال مرحوم ع

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

یہ غور وفکر کہ نوعِ انسانی کس حالت میں مبتلا ہے۔ خاص طور پر خود آپ ؐ کی قوم اخلاق کے اعتبار سے کتنی پستی میں مبتلا ہو چکی ہے۔ کسی طرح کے شرک کا دور دورہ ہے۔ معبودِ حقیقی سے لوگ کس طرح اپنا رخ موڑ چکے ہیں۔ یہ سارا غور وفکر نوعِ انسانی کی ضلالت اور گمراہی پر وہ بھاری رنج وغم جس کے بارے میں قرآن مجید میں بار بار گواہی ملتی ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ﴾

’’کیا آپ ؐ اپنے کو اس رنج اور صدمے کی وجہ سے ہلاک کر لیں گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے‘‘۔

یہ وہ کیفیات تھیں جن کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ غارِ حرا میں اعتکاف فرما رہے تھے۔ اسی عالم میں پردے اٹھتے ہیں اور صرف پردے ہی نہیں اٹھتے بلکہ آپ ؐ پوری نوعِ انسانی کی ہدایت پر مامور کیے جاتے ہیں۔ اور آپ ؐ کا دورِ دعوت تا قیامِ قیامت مقرر کیا جاتا ہے۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
اٹھتے ہیں حجاب آخر کرتے ہیں خطاب آخر

یہ ہے تفسیر سورۃ الضحیٰ کے ان الفاظ کی:

﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝٧﴾

’’اور (اللہ نے) پایا آپ ؐ کو (حقیقت کی تلاش میں) سرگرداں تو آپ ؐ پر راہِ ہدایت منکشف کر دی‘‘۔

گویا غارِ حرا کی خلوتوں میں آپ ؐ حقیقت کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے

دروازے کھول دیے گئے‘ پردے اٹھا دیے گئے۔ حضرت جبرائیل امین سے ملاقات ہوئی وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ پہلی ملاقات جس میں نزولِ وحی کا آغاز ہوا ’بَیْنَ النَّوْمِ وَالْیَقْظَةِ‘ یعنی بیداری اور نیند کے بین بین کی سی کیفیت نیم بیداری کے عالم میں ہوئی۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی لکھی ہوئی تختی تھی جس پر آیات مرقوم تھیں:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝١ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝٢ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝٣ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝٤ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝٥﴾ (العلق)

تین مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا:

((مَا اَنَا بِقَارِئٍ)) ’’میں پڑھ نہیں سکتا‘‘۔

اور حضرت جبرائیلؑ نے آپ ؐ کو اپنے سینے سے لگا کر بھینچا اور اس کے بعد اس وحی کا آپ ؐ کے قلبِ مبارک میں نقش قائم ہو گیا۔ یہاں سے گویا محمد رسول اللہ ﷺ کا آفتابِ رسالت طلوع ہو گیا۔ اس کے بعد نزولِ وحی میں کچھ وقفہ رہا ہے پھر جب آیات نازل ہوئیں۔ سورۃ المدثر کی یہ ابتدائی آیات:

﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝١ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝٢ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣﴾

’’اے لحاف اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جائیے۔ کمر کس لیجیے‘‘۔

فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف ہو جائیے اور اپنے ربّ کی کبریائی کا اعلان کیجیے اور اس کی کبریائی کو فی الواقع دنیا میں قائم کیجیے۔ یہ ترجمانی ہے سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات کی۔

بہت سے محققین کی یہ رائے بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے کہ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا آغاز ہوا اور سورۃ المدثر کی ان ابتدائی آیات سے آپ ؐ کی رسالت کا آغاز ہوا۔ واللہ اعلم

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

مکی دور۔ دعوت‘ تربیت اور تنظیم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾

اس سے قبل یہ بات سامنے آ چکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان ہے۔ غلبہ دینِ حق۔ یعنی اُس دینِ حق کو بالفعل قائم‘ غالب اور نافذ کرنا جو آپؐ دے کر بھیجے گئے ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس کے لیے ایک مکمل انقلابی جدوجہد درکار ہے۔ چنانچہ آپؐ کی سیرتِ مطہرہ میں ہمیں وہ تمام مراحل نظر آتے ہیں جو کسی بھی انقلابی جدوجہد میں پیش آنے لازمی ہیں۔ یہی بات ہے جو سورۃ المدثر میں نہایت سادہ الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾

’’(اے محمدؐ!) اپنے ربّ کی کبریائی کا اعلان کرو اور اسے بالفعل قائم اور نافذ کرو‘‘۔

اس انقلابی جدوجہد میں ظاہر بات ہے کہ پہلا مرحلہ جو ہمیں آپ کی حیاتِ طیبہ کے مکی دور میں نظر آتا ہے۔ وہ مشتمل ہے دعوت و تبلیغ اور تزکیے اور تنظیم پر۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں تک تنظیم کا تعلق ہے اس کی بنیاد تھی لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان اور آپؐ کی بے چون وچرا اطاعت اور آپ سے بہ دل و جان محبت۔ یہی وہ چیز ہے جس نے آپؐ پر ایمان لانے والوں کو ایک بنیانِ مرصوص بنا دیا۔ ایک ایسی طاقت اور ایک ایسی قوت کہ جو حضور ﷺ کے اشاروں پر حرکت کرتی تھی۔ آپؐ کے چشم و ابرو کے اشارے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنا تن من دھن سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے ہر دم آمادہ رہتے تھے البتہ جہاں تک دعوت یا تبلیغ کا تعلق ہے اُس کے ضمن میں سب سے پہلے تو یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس کا مرکز ومحور اور اس کا منبع اور اس کا مدار

قرآن حکیم ہے۔ دعوت ہو یا تبلیغ‘ انذار ہو یا تبشیر‘ نصیحت ہو یا موعظت‘ یہاں تک کہ تربیت ہو یا تزکیہ۔ ان سب کی اساس اور ان سب کی بنیاد قرآن مجید پر ہے۔ یہ بات قرآن حکیم میں چار مقامات پر آئی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا جو منہج عمل ہے جو آپؐ کا طریقہ کار ہے اس کی بنیاد ہے:

﴿یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾

’’(ہمارا یہ رسولؐ) اُن پر اُس (یعنی اللہ) کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب یعنی احکامِ الٰہی اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے‘‘۔

اسی حقیقت کو مولانا حالی نے نہایت سادہ الفاظ میں یوں ادا فرمایا:

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

پس یہ بات سامنے رہنی چاہیے کہ اگرچہ اس دعوت کا ہدف اور مقصود‘ تکبیرِ ربّ ہے یا اعلائے کلمۃ اللہ ہے یا اظہارِ دینِ حق ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

’’وہی اللہ ہے جس نے بھیجا اپنا رسول‘ الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ وہ (رسول) اس کو ہر جنس دین پر پورا کا پورا غالب کر دے‘‘۔

لیکن اس کا نقطۂ آغاز ہے ’’انذار‘‘ یعنی خبردار کرنا‘ آگاہ کرنا۔ وقوعِ قیامت سے خبردار کرنا‘ جزاء وسزائے اُخروی سے خبردار کرنا۔ یہ خبردار (Warn) کرنا یہ ’انذار‘ دعوتِ نبوی کا نقطۂ آغاز ہے اور یہ بات جان لینی چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے نقشِ قدم پر اگر کبھی کوئی دعوت اٹھائی اور برپا کرنی مقصود ہو تو اُس کا نقطۂ آغاز بھی ’انذار‘ ہی ہوگا۔

پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اس دعوت کے ضمن میں ہمیں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ میں ایک نہایت فطری اور حکیمانہ تدریج نظر آتی ہے۔ یہ دعوت الاقرب فالاقرب کے اصول پر آگے بڑھتی ہے۔ اس کا آغاز گھر سے ہوا‘ آپؐ پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا ہیں۔ آپؐ کی زوجہ محترمہ کے بعد

آپؐ کے چچازاد بھائیؓ ہیں جو آپؐ کے زیرِ کفالت بھی ہیں اور زیرِ تربیت بھی یعنی حضرت علیؓ۔ پھر آپؐ کے انتہائی گہرے دوست ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور پھر آپؐ کے وہ غلام ہیں کہ جنہیں آپ نے آزاد کر کے اپنا مُنہ بولا بیٹا بنالیا تھا' یعنی حضرت زید ابن حارثہؓ یہاں سے دعوت آگے بڑھی کنبے اور قبیلے کی طرف۔ پھر جب تک کہ آپؐ اہل مکہ سے مایوس نہیں ہو گئے آپؐ نے اپنی پوری دعوتی سرگرمی مکے ہی تک محدود رکھی۔ مکے والوں سے مایوس ہو کر ۱۰ نبوی میں آپؐ نے طائف کا سفر کیا لیکن وہ بھی دولتِ اسلام سے محروم رہے۔ پھر جب مکے والوں کی مخالفت کی بنا پر آپؐ کو ہجرت کرنا پڑی تب بھی چھ سال کے عرصہ تک' جب تک کہ اہل عرب نے آپؐ کی حیثیت کو تسلیم نہ کر لیا' صلح حدیبیہ کی شکل میں' آپ نے اپنی تمام تر توجہات اندرونِ ملک عرب میں ہی مرتکز رکھیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ نے بیرونِ ملک دعوت کا آغاز فرمایا۔ یہ ہے تدریج جو بالکل فطری ہے۔ اور نہایت حکیمانہ ہے آخری بات اس ضمن میں یہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے وہ تمام وسائل اختیار فرمائے جو اس وقت موجود تھے۔ چنانچہ جب آپؐ کو حکم ہوا کہ:

﴿وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ﴾

''اور (اے نبیؐ) خبردار کیجیے اپنے قبیلے اور قرابت داروں کو۔''

تو آپؐ نے دو دفعہ دعوتِ طعام کا اہتمام فرمایا اور وہاں اپنی دعوت پیش کی اگرچہ بظاہر احوال اور ہمارے دنیوی معیارات کے اعتبار سے یہ دونوں کوششیں ناکام رہیں۔ بعد میں جب اسی طریقے سے بذریعۂ وحی آپ کو حکم ہوا:

﴿فَاصۡدَعۡ بِمَا تُؤۡمَرُ﴾

''(اے نبیؐ!) پس آپ علی الاعلان دعوت دیجیے اس بات کی جس کا آپؐ کو حکم دیا گیا ہے''۔

اب ڈنکے کی چوٹ وہ بات کہیے جس کے لیے آپؐ مامور ہوئے ہیں تو آپؐ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر وہی نعرہ بلند کیا جس کا عرب میں رواج تھا واصباحا! ''ہائے وہ صبح

جو آنے والی ہے''۔ جس پر لوگ جمع ہو گئے اور آپؐ نے جب انہیں عذابِ آخرت سے خبردار کیا تو آپ کا سگا تایا ابولہب مجمع میں سے بولتا ہے:

تَبًّا لَکَ ، اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا؟

معاذ اللہ' نقلِ کفر' کفر نباشد۔ اے محمدؐ تمہارے ہاتھ ٹوٹ جائیں کیا تم نے ہمیں اس کام کے لیے جمع کیا تھا۔ اس پر سورۃ اللھب نازل ہوئی جس کی پہلی آیت ہے:

﴿تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَہَبٍ وَّتَبَّ﴾

''اصل میں تو ہاتھ ٹوٹ گئے ابولہب کے اور ہلاک و برباد ہو گیا وہ خود''

یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ابتداء تو اگرچہ آنحضور ﷺ نے خود فرمائی دعوت و تبلیغ کے میدان میں لیکن جو لوگ آپؐ پر ایمان لائے اُن میں سے ہر شخص اپنی جگہ پر ایک داعیٔ حق بن گیا۔ ان میں نمایاں ترین مقام ہے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا۔ آپؐ پر ایمان لانے کے بعد وہ خود مجسم داعی بن گئے۔ وہ خود مبلغ بن گئے چنانچہ ہمیں یہ معلوم ہے کہ صحابہ کرامؓ میں جو چوٹی کے دس صحابہؓ ہیں جنہیں ہم عشرۂ مبشرہ کے نام سے جانتے ہیں اُن میں سے چھ وہ ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق کی دعوت و تبلیغ پر ایمان لائے۔ اُن میں حضرت عثمان بھی ہیں' اُن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بھی ہیں' ان میں حضرت طلحہ بھی ہیں' حضرت زبیر بھی ہیں' حضرت سعد بن ابی وقاص بھی ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنھم وارضاھم۔ دعوت کے اس عمل پر جو ردِّعمل کفار کی طرف سے اور سردارانِ قریش کی جانب سے ظاہر ہوا' اُس میں بھی ہمیں ایک عجیب ترتیب نظر آتی ہے۔ وہی ترتیب جو ہمیشہ کسی انقلابی دعوت کے خلاف ردِّعمل میں ظاہر ہونی ضروری ہے۔ چنانچہ فوری ردِّعمل جو ابتداء میں ظاہر ہوا وہ استہزا اور تمسخر کا تھا۔ گویا کہ چٹکیوں میں بات اڑانے کی کوشش کی گئی حضور ﷺ کو مجنون قرار دیا گیا' آپؐ پر معاذ اللہ پاگل پن کی پھبتی چست کی گئی۔ کہا گیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خللِ دماغی کا عارضہ لاحق ہو گیا ہے یا شاید کسی آسیب کا اثر ہو گیا ہے۔ یہ کچھ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہیں اچھے بھلے آدمی تھے نہ معلوم کیا ہوا۔ (نقل کفر' کفر نہ باشد) نبی اکرم ﷺ جب یہ باتیں سنتے تھے اور آپؐ کے

قلبِ مبارک پر رنج واندوہ کی کیفیت طاری ہوتی تھی‘ تو وحیٔ خداوندی تسلی وتشفی ودلجوئی کے لیے نازل ہوئی تھی:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝﴾

’’ن ۔قسم ہے قلم کی اور اُس چیز کی جسے لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔(اے نبی) آپؐ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں اور یقیناً‘ آپؐ کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔اور بے شک آپؐ اعلیٰ اخلاق کے مرتبے پر فائز ہیں‘‘۔

اس کے بعد جب بات آگے بڑھی قریش نے یہ دیکھا کہ جسے ہم ایک مشتِ غبار سمجھتے تھے وہ تو ایک بہت بڑی آندھی کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ ہمارے اقتدار‘ ہماری سیادت‘ ہماری دیرینہ روایات‘ ہماری تہذیب وتمدن اور ہمارے عقائد ومذہب کے خلاف ایک بہت بڑی انقلابی جدوجہد کا آغاز ہو چکا ہے۔گویا کہ علامہ اقبال کے الفاظ میں انہوں نے دیکھا کہ ع

’’نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے!!‘‘

تو اب پھر وہی ردِّعمل ظاہر ہوا جو ہمیشہ ظاہر ہوتا ہے یعنی تشدد بہیمانہ تشدد۔ شدید persecution اور ظاہر بات ہے کہ اس کا سب سے بڑا حصہ انہی صحابہؓ کے حصے میں آیا جو کہ غلاموں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔جن کا کوئی حمایتی نہیں تھا جن کی طرف سے کوئی بولنے والا نہیں تھا۔حضرات خباب بن الارت‘ حضرت لبینہ‘ آلِ یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ان سب پر جو کچھ بیتی ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے بڑے انمٹ نقوش ہیں اور انہوں نے جس طرح صبر اور استقامت کے ساتھ جس پامردی کے ساتھ ان تمام مصائب کو جھیلا ہے اور ایمان پر ثابت قدم رہے ہیں وہ بھی تاریخ دعوت و عزیمت کے نہایت اہم نشاناتِ راہ ہیں۔تیسرا ردِّعمل اُس وقت سامنے آتا ہے جب یہ محسوس کر لیا گیا کہ ہمارے یہ تمام حربے ناکام ہو چکے۔کسی ایک شخص کو بھی ہم ایمان سے واپس کفر میں نہیں لا سکے۔ ہمارا یہ سارا تشدد ناکام ہو چکا تو پھر تیسرا حربہ آزمایا گیا۔ یہ

حربہ ہے مصالحانہ پیشکشوں کا۔ یہ جال ہے لالچ کا۔ چنانچہ ابن ربیعہ قریش کی طرف سے نمائندہ بن کر حضور ﷺ کی خدمت میں آتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اے محمدؐ اگر تم بادشاہت کے خواب دیکھ رہے ہو تو اگرچہ ہم اُس مزاج کے نہیں ہیں کہ کسی کو بادشاہ مان سکیں لیکن تمہیں ہم اپنا بادشاہ بھی تسلیم کر لیں گے۔ اگر تمہیں دولت چاہیے تو ذرا اشارہ کرو‘ قدموں میں دولت کے انبار لگا دیئے جائیں گے۔ کہیں شادی کرنے کی خواہش ہو تو صرف اشارہ کرنے کی ضرورت ہو گی جس گھرانے میں کہو تمہاری شادی کرا دی جائے گی۔لیکن بہرحال تم اس کام سے باز آ جاؤ۔جس نے قریش کے اندر تفرقہ پیدا کر دیا ہے۔اس کا جو جواب دیا محمد رسول اللہ ﷺ نے وہ تاریخ عزیمت میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے:

’’اگر تم لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور ایک ہاتھ میں چاند رکھ دو تب بھی میں اُس کام سے باز نہیں آ سکتا۔جس پر میں اپنے ربّ کی جانب سے مامور ہوا ہوں‘‘۔

نتیجہ یہ نکلا کہ وہ وقت بھی آیا کہ آخری الٹی میٹم دیا گیا اور ایک وفد ابوطالب کے پاس آتا ہے جو حضور ﷺ کی پشت پناہی کیے چلے جا رہے ہیں اور انہی کی وساطت سے بنی ہاشم کا پورا خاندان گویا نبی اکرم ﷺ کی پشت پر تھا۔قریش کی طرف سے انہیں الٹی میٹم ملتا ہے کہ اے ابوطالب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔اب دو ہی راستے ہیں یا محمدؐ کی حمایت سے دست کش ہو جاؤ (ﷺ) یا پھر میدان میں آؤ اور مقابلہ کرو۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ ابوطالب کی ہمت بھی جواب دے گئی۔انہوں نے حضور ﷺ کو بلایا اور یہ کہا کہ بھتیجے مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ جسے میں برداشت نہ کر سکوں۔اور یہی وہ واحد موقع نظر آتا ہے کہ جب حضور ﷺ کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔آپؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔لیکن آپؐ نے بات وہی کہی جو عزیمت کا تقاضا تھا:

’’چچا جان اب یا تو یہ کام پورا ہو کر رہے گا جو میرے ربّ کی جانب سے میرے حوالے کیا گیا ہے۔اور یا مَیں اسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دوں گا‘‘۔

نبی اکرم ﷺ پر ذاتی اعتبار سے بھی ایذاء و آزمائش کے بہت سے مراحل آئے۔ آپؐ پر دست درازی بھی ہوئی‘ آپؐ کے شانۂ مبارک پر راکھ بھی ڈالی گئی‘ آپؐ کے راستے میں کانٹے بھی بچھائے گئے‘ آپؐ کی گردن میں ایک چادر کو بل دے کر اور ایک پھندے کی صورت میں ڈال کر اُس کے دونوں سروں کو کھینچا گیا کہ آپؐ کی آنکھیں ابل آئیں۔ ایسا بھی ہوا کہ آپ سربسجود تھے اپنے خالق کے سامنے اور عین کعبے کی دیوار کے سائے میں اور وہاں عقبہ بن ابی معیط‘ ابوجہل کی شہ پر ایک اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی لاکر حضور ﷺ کے شانۂ مبارک پر رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب یہ تعدی‘ یہ تشدد‘ یہ ظلم و ستم انتہائی شدت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور پورے خاندان بنی ہاشم کو نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تین سال تک ایک گھاٹی میں محصور ہو کر گویا کہ ایک طرح کی نظر بندی کی صورت میں بسر کرنے پڑتے ہیں جس کے دوران شدید ترین مقاطعہ ہے‘ کھانے پینے کی کوئی چیز گھاٹی میں داخل نہیں ہونے دی جا رہی۔ وہ وقت بھی آیا کہ بنی ہاشم کے بھوک سے بلکتے ہوئے بچوں کے حلق میں ڈالنے کے لیے اس کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا کہ چمڑے کے سوکھے جوتوں کو ابال کر اُن کا پانی ٹپکا دیا جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے ذاتی ابتلا کا ابھی نقطہ عروج باقی تھا اور یہ نکتہ عروج ۱۰ نبوی میں پہنچ گیا۔ اس سال اگرچہ شعب بنی ہاشم کی اس نظر بندی سے تو رہائی مل گئی لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان و ابتلاء نے اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گئے کہ ایک ہی سال میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کا بھی انتقال ہو گیا اور ابوطالب کا بھی۔ گھر میں ایک دلجوئی کرنے والی رفیقہ حیات تھی وہ بھی نہ رہی اور خاندان کی پشت پناہی کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ابوطالب تھے وہ بھی اٹھ گئے۔ یہ وہ سال ہے جسے نبی اکرم ﷺ عام الحزن سے تعبیر فرماتے ہیں یہ رنج اور غم اور اندوزہ کا سال ہے۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

مکی دور......ابتلاء کی انتہا اور ہجرتِ مدینہ

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾﴾

’’اور (اے نبی) دعا کرو کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال‘ سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے مجھے غلبہ عطا فرما اور اس کو میرا مددگار بنا دے‘‘۔

کل ہم نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مکی دور کے تذکرے کے ضمن میں عام الحزن تک پہنچ گئے تھے یعنی نبوت کا دسواں سال جس میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کا بھی انتقال ہو گیا اور ابوطالب کی وفات ہو گئی نتیجتاً سرداران قریش کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور دار الندوہ میں نبی اکرم ﷺ کے قتل کے مشورے شروع ہو گئے چنانچہ آنحضور ﷺ نے فطری طور پر ادھر ادھر دیکھا کہ مکے کے سوا کوئی اور جگہ کونسی ہو سکتی ہے جسے آپؐ اپنی دعوت کے لیے مرکز اور base کی حیثیت سے استعمال کر سکیں۔ مکے سے قریب ترین طائف ہے چنانچہ ایک اُمید لے کر نبی اکرم ﷺ نے طائف کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر انتہائی کسمپرسی کے عالم میں ہوا ہے اس میں حضور ﷺ کے ساتھ وہ بھی موجود نہیں جو پوری زندگی سائے کی طرح ساتھ رہے‘ یعنی ابوبکر صدیق ؓ۔ آپؐ کی رفاقت میں صرف آپؐ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید ابن حارثہؓ ہیں۔ پھر عام راستہ چھوڑ کر انتہائی دشوار گزار راستہ اختیار کیا گیا۔ اس لیے کہ اندیشہ تھا کہ کہیں مڈھ بھیڑ نہ ہو۔ آپؐ طائف پہنچے۔ وہاں کے تین سرداروں سے ملاقات کی۔ اس خیال سے کہ اللہ تعالیٰ اگر ان میں سے کسی کو ایمان لانے کی توفیق عطا فرما دے تو کیا عجب کہ طائف کا یہ شہر اس انقلابی دعوت کا مرکز اور base بن جائے۔ لیکن جو صورت حال سامنے آتی

ہے وہ واقعہ یہ ہے کہ بیان کرتے ہوئے بھی دل شق ہوتا ہے اور سننے کے لیے بھی بڑے جگر کی ضرورت ہے۔ تینوں نے اس قدر تمسخر آمیز اور تحقیر آمیز انداز اختیار کیا کہ پچھلے پورے دس سالوں کے دوران محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسا معاملہ کبھی پیش نہ آیا تھا۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ کسی کہنے والے نے یہ کہا کہ اگر اللہ نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے تو وہ گویا خود کعبے کے پردے چاک کر رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ مَیں تم سے بات بھی کرنے کے لیے تیار نہیں اس لیے کہ اگر تم سچے ہو اور واقعتاً رسول ہو تو ہو سکتا ہے کہ میں کہیں توہین کا مرتکب نہ ہو جاؤں اور عذابِ خداوندی کا مَیں نوالہ بن جاؤں اور تم جھوٹے ہو تو جھوٹے اس قابل نہیں ہوتے کہ انہیں مُنہ لگایا جائے۔ کسی نے بڑے ہی تمسخر اور تحقیر کے ساتھ کہا کہ کیا اللہ کو تمہارے سوا کوئی اور شخص نبوت و رسالت کے لیے نہیں ملتا تھا۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں جب حضور ﷺ بظاہر احوال مایوس ہو کر لوٹنے لگے تو انہوں نے کچھ ''غنڈوں'' کو اشارہ کر دیا۔ اوباش لوگ حضور ﷺ کے گرد ہو گئے پھر وہ نقشہ جما ہے کہ اس کرۂ ارضی پر اللہ کے رسول ﷺ محبوبِ رب العالمین' سید الاولین والآخرین اور آپ کے گرد کچھ اوباش لوگ ہیں۔ جو پتھراؤ کر رہے ہیں' تاک تاک کر ٹخنے کی ہڈیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے' تالیاں پیٹی جا رہی ہیں' حضور ﷺ کا جسم مبارک لہولہان ہو گیا ہے' نعلین خون سے بھر گئی ہیں۔ ایک موقع پر حضور ﷺ ضعف کی وجہ سے ذرا بیٹھ گئے تو دو غنڈے آگے بڑھتے ہیں ایک بغل میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ دوسرا دوسری میں اور اٹھا کر کھڑا کر دیتے ہیں کہ چلو۔ محمد رسول اللہ ﷺ پر ذاتی اعتبار سے ابتلاء اور امتحان کا نقطۂ عروج ہے۔ یہ climax ہے' چنانچہ حضور ﷺ جب واپس آئے تو وہ دعا آپؐ کی زبان مبارک سے نکلی ہے جس کو پڑھتے ہوئے کلیجہ شق ہوتا ہے:

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْا ضُعْفَ قُوَّتِیْ وَقِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ

''اے اللہ کہاں جاؤں کہاں فریاد کروں۔ تیری ہی جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں۔ اپنی قوت کی کمی کا' اپنے ذرائع و وسائل کی کم کا اور لوگوں میں جو یہ رسوائی ہو رہی ہے اس کا''۔

اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ؟ اِلٰی بَعِیْدٍ یَّتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَّلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ؟

''اے اللہ تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے کیا تو نے میرا معاملہ دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جو چاہیں میرے ساتھ کر گزریں''۔

لیکن اس کے ساتھ ہی بارگاہِ خداوندی میں وہ عبدِ کامل عرض کرتا ہے:

اِنْ لَّمْ یَکُنْ عَلَیَّ غَضَبُکَ فَلَا اُبَالِیْ

''پروردگار اگر تیری رضا یہی ہے اگر تو ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کوئی پرواہ نہیں''

ع سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!

اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْھِکَ الَّذِیْ اَشْرَقَتْ لَہُ الظُّلُمٰتُ

''پروردگار میں تو تیرے ہی روئے انور کی ضیاء کی پناہ میں آتا ہوں''

یہ ہے وہ دعا جس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ع

اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ فوراً ملک الجبال حاضر ہوتا ہے وہ فرشتہ کہ جو پہاڑوں پر مامور ہے۔ اور وہ عرض کرتا ہے کہ حضور ﷺ اللہ نے مجھے آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ حکم دیں تو مَیں ان پہاڑوں کو ٹکرا دوں جن کے مابین وادی میں یہ طائف کا شہر واقع ہوا ہے۔ تاکہ اس کے رہنے والے پس کر سرمہ بن جائیں۔ اس پر وہ رحمۃ للعالمین ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''میں لوگوں کے لیے عذاب نہیں بھیجا گیا'' اگرچہ یہ لوگ مجھ پر ایمان نہیں لا رہے لیکن کیا عجب! ان کی آئندہ نسلوں کو اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق عطا فرمائے''۔

اور ہمارے لیے یہ بات بڑی قابل توجہ ہے کہ سرزمین پاک و ہند پر اسلام کی ہدایت کا سورج جو پہلی مرتبہ طلوع ہوا تو اس کے لانے والے محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ جو ثقفی تھے بنو ثقیف کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جو طائف ہی کا ایک قبیلہ تھا۔ بہرحال نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں یومِ طائف ایک turning point ہے ایک اعتبار سے شدید ترین دن ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ حضور ﷺ سے سوال

کیا کہ کیا آپؐ پر یومِ اُحد سے بھی زیادہ سخت دن بھی کوئی گزرا ہے! تو آپؐ نے فرمایا: ہاں طائف کا دن مجھ پر اس سے کہیں زیادہ سخت تھا۔ لیکن جیسے کہ مولانا مناظر احسن گیلانی نے بہت ہی عمدہ نکتہ ارشاد فرمایا ہے یہ دن turning point ہے حضور ﷺ کی زندگی میں۔ آج کے دن تک گویا کہ اللہ نے نبی اکرم ﷺ کو دشمنوں کے حوالے کیا ہوا تھا کہ جس طرح چاہو انؐ کے صبر کا امتحان لے لو۔ جس طرح چاہو اِنؐ کی استقامت کو جانچ لو ہمارے اس نبیؐ کی سیرت و کردار کا لوہا خوب ٹھوک بجا کر دیکھ لو کہ اس میں کہیں کھوٹ تو نہیں تمہیں پوری چھوٹ ہے۔ لیکن اس دن کے بعد اب نصرتِ خداوندی کا ظہور شروع ہوتا ہے فوری طور پر ملک الجبال کی حاضری ہے لیکن اصل ظہور ہوتا ہے مکے واپسی کے بعد اب ٹھنڈی ہوائیں آنے لگیں، ایک راستہ خود بخود رحمتِ خداوندی سے کھلتا ہے ۱۰ نبوی ہی کے ماہِ رجب میں نبی اکرم ﷺ کی ملاقات چھ افراد سے ہوتی ہے جو مدینے سے آئے ہوئے تھے اور یہ چھ اشخاص حضور ﷺ پر ایمان لے آتے ہیں۔ منیٰ کی وادیوں میں سے ایک وادی ہے جہاں ملاقات ہوئی۔ اگلے سال پھر یہ لوگ آتے ہیں ۱۱ نبوی میں۔ اور بارہ افراد حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں یہ بیعت عقبہ اولیٰ کہلاتی ہے۔ اور پھر وہ درخواست کرتے ہیں کہ حضور ﷺ ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص بھیجئے جو ہمیں قرآن کی تعلیم دے اس لیے کہ آپؐ کی دعوت اور آپؐ کی تربیت و تزکیے کا مرکز ومحور قرآن حکیم ہی تھا: ع

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند!

چنانچہ قرعہ فال نکلا حضرت مصعب بن عمیرؓ کے نام۔ حضور ﷺ انہیں مدینہ منورہ بھیجتے ہیں۔ وہ حضرت سعد ابن زرارہؓ کے گھر پر جا کر قیام کرتے ہیں اور شب و روز دعوتِ قرآنی کو پھیلا رہے ہیں مدینہ منورہ میں۔ ایک سال کی محنت کا حاصل ۱۲ نبوی میں ۷۵ افراد کو لا کر محمد رسول اللہ ﷺ کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ ۷۲ مرد ہیں اور تین عورتیں۔ بیعت عقبہ ثانیہ ہوتی ہے جو تمہید ہے ہجرت کی اس وقت جو تقاریر ہوئی ہیں۔ حضرت عباس جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، حضور ﷺ کے چچا ؓ، انہوں

نے انصارِ مدینہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ لوگو! اس بات کو جان لو کہ محمد (ﷺ) ہمیں بہت عزیز ہیں۔ ہمارے لیے انتہائی محترم ہیں۔ ہماری آنکھوں کا تارا ہیں، اب تک ہم نے ان کی پوری حفاظت کی ہے۔ چونکہ بنی ہاشم نے نبی اکرم ﷺ کی حمایت جاری رکھی تھی۔ اب اگر تم انہیں اپنے ہاں لے کر جانا چاہتے ہو تو جان لو کہ تمہیں ان کی حفاظت کرنی ہو گی۔ اپنے اہل وعیال سے بڑھ کر اور اگر اس کی ہمت نہیں پاتے تو ابھی جواب دے دو۔ لیکن انصارِ مدینہ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ اگر حضور ﷺ ہمارے ساتھ مدینے تشریف لے جائیں تو ہم اُن کی اسی طرح حفاظت کریں گے جیسے کہ اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں۔ اس وقت وہی حضرت سعد ابن زرارہ کھڑے ہوتے ہیں ؓ اور وہ بھی انصارِ مدینہ کو متنبہ کرتے ہیں کہ لوگو! اچھی طرح سمجھ لو ایک بہت بڑی ذمہ داری قبول کر رہے ہو۔ محمد (ﷺ) کو دعوت دینا اور ساتھ لے کر جانا سرخ وسیاہ آندھیوں کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ معلوم ہوا کہ جو کچھ ہوا وہ اندھیرے میں نہیں ہوا پوری طرح سمجھ کر ہوا۔ پوری حقیقت کو جاننے کے ساتھ ہوا۔ جو ذمہ داری انصارِ مدینہ نے سنبھالی اور اٹھائی ان کو پورے طور پر سمجھ کر اُس کے نتائج وعواقب پر نگاہ رکھ کر اٹھائی۔ بہرحال یہ ۱۲ نبوی میں جو بیعت عقبہ ثانیہ ہوئی یہ تمہید بن گئی ہجرت کی۔ نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو عام اجازت دے دی کہ مدینے کی طرف ہجرت کر جائیں، بہت سے لوگ جا چکے تھے۔ لیکن یہ قاعدہ ہے کہ رسول اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا وہ اپنے مستقر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ جب تک کہ اللہ کی طرف سے واضح اجازت نہ آ جائے۔ بالآخر وہ وقت آیا کہ اجازت آ گئی اور نبی اکرم ﷺ اپنے اُسی انتہائی گہرے دوست جو یارِ غار اور رفیق راہ ہے، حضرت ابوبکر صدیق ؓ، اُن کی معیت میں مکے ہجرت فرما کر مدینے کی طرف روانہ ہو رہے ہیں۔ زبانِ مبارک پر وہ دعا ہے جو سورۂ بنی اسرائیل میں گویا کہ اس ہجرت کی تمہید کے طور پر آپؐ کو تلقین فرما دی گئی تھی:

﴿وَقُلۡ رَّبِّ اَدۡخِلۡنِیۡ مُدۡخَلَ صِدۡقٍ وَّاَخۡرِجۡنِیۡ مُخۡرَجَ صِدۡقٍ وَّاجۡعَلۡ لِّیۡ

﴿مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿٨٠﴾﴾

’’پروردگار مجھے جہاں داخل فرما رہا ہے وہ صدق و صداقت اور راستی کا داخلہ ہواور جہاں سے تو مجھے نکال رہا ہے وہاں سے میرا یہ نکلنا بھی راست بازی اورصدق پر مبنی ہو۔ اوراے ربّ مجھے اپنے خاص خزانۂ فضل سے وہ غلبہ وقوت واقتدار عطا فرما جو اس مشن میں میرا ممد و معاون ہو جو تو نے میرے حوالے کیا ہے‘‘۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تین دن تک غارِ ثور میں چھپے رہے ہیں اس وقت وہ مرحلہ بھی آیا ہے کہ کھوجی بالکل اُس کے دہانے تک پہنچ گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے لیے نہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اندیشہ ناک ہو کر گھبراتے ہوئے یہ عرض کرتے ہیں کہ حضور اگر ان میں سے کسی نے غیر ارادی طور پر اپنے قدموں کی طرف بھی نگاہ ڈال لی تو ہم دیکھ لیے جائیں گے۔ ہم پکڑے جائیں گے لیکن وہ کوہِ صبر، وہ کوہِ صبر و ثبات و استقامت جس کو اللہ کی ذات پر یقین حاصل تھا۔ معیت خداوندی جس کی قوت کا اصل راز تھی وہ فرماتا ہے:

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾

’’گھبراؤ نہیں، کسی رنج وغم کا کوئی موقع نہیں ہے اللہ ہمارے ساتھ ہے‘‘۔

وہ ہمارا رفیق ہمارا مددگار ہے۔ بہرحال یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ ہجرتِ مدینہ کے نتیجے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد ایک بالکل نئے دور میں داخل ہوگئی۔ اگر جدید انقلابی اصطلاحات کو استعمال کیا جائے تو passive resistance کا دور ختم ہوا اور اب ایک active resistance کا دور شروع ہو رہا ہے۔ اب تک حکم تھا کہ ہاتھ بندھے رکھو، ماریں کھاؤ، لیکن جھیلو، صبر کرو اور برداشت کرو reteliate کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کو حکم دیا گیا کُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ۔

اپنے ہاتھ بندھے رکھو تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے لیکن پھر بھی تمہیں اجازت نہیں کہ مدافعت میں بھی اپنے ہاتھ اٹھا سکو۔ تمہیں ہلاک کر دیا جائے شہید کر دیا جائے تمہیں اجازت نہیں کہ اپنی مدافعت میں ہاتھ اٹھا سکو۔ لیکن اب وہ ہاتھ کھول دیے

گئے۔ سورۃ الحج کی یہ آیۂ مبارک اس مرحلہ پر نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ﴿٣٩﴾﴾

’’اجازت دے دی گئی اُن کو جن پر جنگ ٹھونس دی گئی ہے جن پر ظلم و ستم کے پہاڑ اٹھائے گئے ہیں۔ اُن کے لیے آج سے اجازت ہے کہ وہ بھی اب جواب دیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ اُن کے لیے اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کا وعدہ ہے اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے‘‘۔

﴿الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ﴾

’’ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے خدائے واحد پر ایمان لانے کا اعلان کیا۔ آج اُن کو اجازت دی جا رہی ہے کہ وہ بھی نہ صرف مدافعت میں ہاتھ اٹھائیں بلکہ کفر کے استیصال کے لیے اقدام کریں۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِیْ وَلَكُمْ فِی الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ

فَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اندرونِ عرب انقلابِ نبویؐ کی تکمیل

اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾ صدق اللہ العظیم

دار الہجرت یعنی مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کے ورودِ مسعود کی تاریخ ۸/ربیع الاول ۱۳ نبوی ہے۔ جو سن عیسوی کے مطابق ۲۰/ستمبر ۶۲۲ء قرار پاتی ہے۔ یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ ہجرت کے نتیجے میں نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کوئی گوشۂ عافیت میسر آ گیا تھا۔ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ ہجرت کے بعد سے نبی اکرم ﷺ کی جدوجہد شدید ترین مراحل میں داخل ہوئی۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے (ہجرت کے بعد کے) دس سال میں واقعہ یہ ہے کہ ایک بھرپور ہمہ جہتی اور ایک مکمل انقلابی جدوجہد اپنے تمام اطراف و جوانب اور تقاضوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد آپؐ کی جدوجہد کے تین اہم گوشے ہماری نگاہوں کے سامنے آتے ہیں:

سب سے پہلے یہ کہ آپؐ کا مثبت کام، جو قرآن حکیم کی اس آیت میں واضح کیا گیا کہ: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ کے حدود وسیع تر ہو گئے۔ چنانچہ ایک جانب ایک آزاد مسلمان معاشرہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرما دیا اس کی تطہیر افکار اور تعمیر کردار کا فریضۂ منصبی ہے جو بجائے خود ایک سخت مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ دوسری طرف آپؐ کی دعوت و تبلیغ کی حدود کی توسیع ہے جس کے نتیجے میں ایک نئی ضرورت سامنے آئی کہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت تیار کی جائے جو نبی اکرم ﷺ کی صحبت سے اس درجے فیض یافتہ ہوں اور تعلیم و تربیتِ نبویؐ سے اس درجہ حصہ پا چکے ہوں کہ پھر انہیں عرب کے اطراف و جوانب میں پیغامِ محمدیؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی نشر و اشاعت کے لیے بھیجا جا سکے۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان

دونوں کاموں کے لیے حضور ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف لاتے ہی سب سے پہلے قبا مسجد میں مسجد تعمیر فرمائی اور پھر مدینے کے مرکز میں مسجد نبویؐ کی تعمیر کا آغاز فرمایا۔ یہ گویا کہ عملی تفسیر ہے اس آیۂ مبارکہ کی جو سورۃ الحج میں اذنِ قتال والی آیت کے فوراً بعد آتی ہے کہ:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾

گویا یہ وہ فرضِ منصبی ہے کہ جس کی جانب محمد رسول اللہ ﷺ ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔

دوسری جانب مدینہ منورہ میں جو ایک آزاد مسلمان حکومت قائم ہوئی جو ابتداءً تو ایک چھوٹی سی شہری ریاست تھی لیکن جسے حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی کے دوران عرب کے اطراف و جوانب تک وسیع ہونا تھا اور جسے آئندہ ایک عالمی اسلامی ریاست کے لیے پیش خیمہ اور نمونہ بننا تھا جس کے ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے تدبر اور حسن تدبیر، معاملہ فہمی، پیش بینی اور آپؐ کے حسن انتظام کے جو مظاہر سامنے آتے ہیں، آنجنابؐ کے تمام سیرت نگار خواہ وہ آپؐ کے ماننے والے ہوں یا آپؐ کی رسالت کے منکر ہوں اور یہ انکار دشمنی کی حدود تک پہنچ گیا ہو سب نے اس کا اعتراف کیا ہے اور کھلے دل کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ منٹگمری واٹ نبی اکرم ﷺ کے حسن تدبیر کو جن شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کرتا ہے واقعہ یہ ہے کہ شاید ہی نسل آدم کے کسی اور شخص کے لیے ان الفاظ کو استعمال کیا گیا ہو۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے کمال حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے سب سے پہلے یہود کے تینوں قبیلوں سے معاہدے کر لیے اور انہیں اس قول و اقرار میں جکڑ لیا جن کی بنا پر وہ کبھی بھی نبی اکرم ﷺ کی مخالفت سامنے آ کے نہ کر سکیں۔ ایک دوسرا عنصر جو مدینہ منورہ کی چھوٹی سی اسلامی ریاست اور چھوٹے سے اسلامی معاشرے میں یہود ہی کے زیر اثر پروان چڑھ رہا تھا۔ وہ منافقین کا گروہ تھا۔ ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ یہ مارِ آستین تھے جو اندر سے حملے کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ ایک طرف اپنے مثبت کام میں مصروف ہیں جو دعوت اور تربیت اور تعلیم و تزکیہ کا کام ہے۔ دوسری طرف مدینہ ہی کے اندر یہود اور منافقین کی سازشوں سے عہدہ برآ ہو رہے

ہیں اور تیسری طرف ہے آپ کا اصل محاذ جس کی جانب ارشاد ہوا اس آیہ مبارکہ میں جس سے آج گفتگو کا آغاز ہوا تھا:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾

جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کے دین کو عملاً نافذ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اب آنحضرتؐ کی جانب سے بھی اقدام ہو۔قتال کا مرحلہ شروع ہو رہا ہے اس سلسلے میں سب سے پہلے قریش حملہ آور ہوتے ہیں اور ایک ہزار کا لشکر جرار آتا ہے۔۲ھ میں نبی اکرم ﷺ مجلس مشاورت منعقد فرماتے ہیں کہ ایک طرف تو شام سے قافلہ آ رہا ہے جو مالِ تجارت سے لدا پھندا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے صرف ڈیڑھ سو اشخاص ہیں۔ دوسری جانب ایک لشکر ہے جو مکہ سے چلا آ رہا ہے۔اب لوگو مشورہ دو ہمیں کدھر کا قصد کرنا چاہیے۔ یہ اصل میں آپؐ نے ایک انتہائی ماہر سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے ساتھیوں کے حوصلے (morale) کا اندازہ کرنے کی تدبیر فرمائی تھی۔

بعض حضرات نے بر بنائے طبع بشری اس خیال کا اظہار کیا کہ ہمیں پہلے قافلے کا رخ اختیار کرنا چاہیے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے وہ لوگ جو نبی اکرم ﷺ کے مزاج شناس تھے انہوں نے یہ بھانپ لیا کہ حضور ﷺ کا قصد کدھر ہے۔ چنانچہ جان نثاروں کی تقریریں ہوئیں حضرت مقدادؓ نے عرض کیا حضور ﷺ ہمیں آپ اصحاب موسیٰؑ پر قیاس نہ فرمائیں جنہوں نے حضرت موسیٰؑ کو یہ کورا جواب دے دیا تھا کہ:

﴿اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ﴾

آپؐ اللہ کا نام لے کر جدھر بھی آپؐ کا ارادہ ہو قصد فرمائیں۔کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمارے ذریعے سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرمائے۔حضور ﷺ کو خاص طور پر انصار کی طرف سے ان کی رائے کا انتظار تھا۔ چنانچہ اس کو بھانپ لیا حضرت سعد ابن عبادہؓ رئیس خزرج کھڑے ہوئے اور انہوں نے عرض کیا کہ حضور ﷺ اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ہم نے آپؐ کی تصدیق کی ہے اب ہمارے لیے کون سا اختیار رہ گیا۔آپؐ کا جدھر کا بھی ارادہ ہو بسم اللہ کیجیے۔اگر آپ ہمیں برک

الغماد تک جانے کا حکم دیں گے تو ہم جائیں گے اور ان شاء اللہ ہم اس سے گریز نہ کریں گے۔آپؐ سمندر میں چھلانگ لگانے کے لیے فرمائیں تو ہم دریغ نہیں کریں گے۔ یہ تھے جاں نثاران محمد ﷺ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

بدر کے میدان میں جنگ ہوئی۔ ایک جانب ۳۱۳ کا بے سروسامان اسلامی لشکر ہے جس کے ساتھ صرف دو گھوڑوں پر مشتمل رسالہ ہے اور دوسری جانب ایک ہزار کا لشکر جرار غرق آہن۔لیکن اللہ نے فتح عطا فرمائی اور اس کو ''یوم الفرقان'' بنا دیا۔ یہ فیصلے کا دن ہے۔آج معلوم ہو گیا کہ صداقت کس کے ساتھ ہے۔ اللہ کی حمایت کسے حاصل ہے۔لیکن یہ فتح جو بدر میں اللہ نے عطا فرمائی اگلے ہی سال ایک دوسرے امتحان کی تمہید بن گئی۔۳ھ میں پھر قریش نے حملہ کیا۔ اس مرتبہ تین ہزار کا لشکر جرار آیا اور اس بار مسلمانوں کو اپنی جماعت کے متعلق پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ سب ہی مؤمنین صادقین نہیں ہیں بلکہ مارِ آستین بھی اب ایک اچھی خاصی تعداد میں اس مسلمان جماعت کے اندر شامل ہو چکے ہیں جنہیں منافقین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔جنہوں نے بروقت دغا دی۔عبداللہ بن اُبی کل ایک ہزار نفری کے لشکر میں سے ۳۰۰ اشخاص کو لے کر واپس مدینے لوٹ گیا۔ یہ جنگ جو دامنِ احد میں لڑی گئی اللہ تعالیٰ نے اسے اہل ایمان کے لیے ابتلاء و آزمائش اور اُن کی تربیت اور تزکیے کا ایک بہت بڑا ذریعہ بنا دیا۔اس میں مسلمانوں کو اپنی ایک غلطی کی وجہ سے ابتداءً کسی قدر شکست سے بھی دوچار ہونا پڑا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کمالِ فضل سے بالآخر مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔ دو سال بعد غزوہ احزاب ہوتا ہے جو غزوہ خندق بھی کہلاتا ہے۔اب بار ہزار کا لشکر جرار مدینہ منورہ پر حملہ آور ہے۔بعض روایات میں تعداد اس سے بھی زائد آئی ہے محاصرہ ہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مشورے سے حضور ﷺ نے محصور ہو کر اور خندق کھود کر دفاع کرنے کی تجویز پر عمل کیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ غزوہ اہل ایمان کے لیے بہت بڑا امتحان ثابت ہوا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کفار کے لشکر کی صورت میں جو آندھیاں آئی تھیں وہ اللہ کی بھیجی ہوئی آندھیوں سے ایسے ختم بھی ہو گئیں۔لیکن اس کے

دوران اہل ایمان کے ایمان کا پورا امتحان ہو گیا اور اہل نفاق کا نفاق بھی پورے طور پر عیاں اور ظاہر ہو گیا۔ غزوۂ خندق میں جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی تو حضور ﷺ نے جن کا دستِ راست حالات کی نبض پر تھا۔ مسلمانوں کو یہ خبر دے دی تھی کہ یہ آخری بار ہے کہ قریش تم پر چڑھ کر آئے تھے: لَا تَغْزُوكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ اب اقدام (initiative) تمہارے ہاتھوں میں ہوگا۔ اب پیش قدمی تم کرو گے۔ چنانچہ ٦ ھ میں اپنے ایک خواب سے بشارت پا کر اور یہ معلوم رہے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے عمرے کی نیت سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی اگرچہ عمرہ اُس سال حضور نہ کر سکے وہ دوسرے سال ہوا۔ لیکن اس صلح حدیبیہ کو اللہ تعالیٰ نے فتح عظیم قرار دیا۔ ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا﴾۔

حدیبیہ میں بظاہر احوال آنحضور ﷺ نے کچھ دب کر صلح کی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کے تدبر کا یہ شاہکار ہے جس کی توثیق فرمائی وحیٔ آسمانی نے کہ یہ فتح مبین ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد حضور ﷺ کو دو سال کا عرصہ ایسا ملا کہ جس میں گویا کہ قریش کے ہاتھ بندھ گئے تھے۔ کوئی مزاحمت اب میدان میں نہ تھی ایک طرف تو اس صلح نے پورے عرب کے سامنے یہ بات روشن کر دی کہ قریش نے گویا کہ محمدؐ اور اُن کے ساتھیوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ گویا کہ ایک طرح کی recognition تھی۔ گویا مان لیا گیا تھا کہ اب آنحضور ﷺ اور مسلمان (They are a power to recon with) اب اُن کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ چنانچہ پورے عرب میں آنحضور ﷺ کی دھاک بیٹھ گئی دوسرے قریش کے ہاتھ بندھ گئے اور گویا کہ حضور ﷺ کے ہاتھ پوری طرح کھل گئے آپؐ کا دعوتی اور تبلیغی سلسلہ پورے دو سالوں کے دوران اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ اصحابِ صفہ کی وہ جماعت جو تعلیم و تربیت نبویؐ سے تیار ہو رہی تھی اُس کو بکثرت وفود کی شکل میں تبلیغ کے لیے عرب کے کونے کونے تک بھیجا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دعوتِ محمدی ﷺ جنگل کی آگ کی طرح پورے عرب میں پھیل گئی۔ اس صورت حال کو دیکھ کر اور کچھ قریش نے خود اپنی غلطی کو محسوس کر کے انہوں نے ایک عاجلانہ اقدام کے ذریعے صلح کو ختم کر دیا اس

کے بعد اُن کے مدبر رہنما ابوسفیان جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' انہوں نے اگرچہ حالات کے رخ کو پہچان کر پوری کوشش کی کہ اس صلح کی تجدید ہو جائے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ کا دستِ مبارک' جس طرح حالات کی نبض کو ٹٹول رہا تھا۔ اُس سے یہ بات آپؐ کے سامنے بالکل عیاں تھی کہ اب کسی صلح کا دوبارہ کرنا گویا کفر اور شرک کو ایک fresh lease of Existence دینا ہے لہٰذا آپؐ نے صلح کی اس کوشش کو قبول نہیں فرمایا اور آپ نے ٨ ھ میں دس ہزار جان نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی معیت میں مکے کی طرف پیش قدمی کی اور اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو ایک فاتح کی حیثیت سے اُس شہر میں کل آٹھ سالوں کے اندر اندر داخل کر دیا۔ جہاں سے آٹھ سال قبل آنحضور ﷺ اپنی جان بمشکل بچا کر نکل سکے تھے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

فتح مکہ کے فوراً بعد طائف کے قبائل کی طرف سے ایک آخری کوشش ہوئی۔ اس کو یہ سمجھا جانا چاہیے کہ عرب میں کفر اور شرک کی طرف سے یہ آخری ہچکی تھی۔ غزوۂ حنین کی شکل میں یہ مقابلہ ہوا ابتداءً وہاں مسلمانوں کو اپنی کثرتِ تعداد کے پیشِ نظر جو کچھ زعم ہو گیا تھا اُس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں کچھ سبق پڑھانے کے لیے شکست سے دوچار کیا لیکن بالآخر نبی اکرم ﷺ کی شجاعت نے رخ پھیر دیا جو اس وقت انتہائی شان کے ساتھ اس طرح ظاہر ہوئی کہ آپؐ اپنی سواری سے اترے آپؐ نے علم اپنے ہاتھ میں لیا اور آپؐ نے یہ رجز پڑھا:

اَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِب   اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِب

اللہ تعالیٰ نے پھر فتح عطا فرمائی۔ یہ گویا کہ پورے جزیرہ نمائے عرب پر نبی اکرم ﷺ کی فیصلہ کن فتح تھی۔ چنانچہ یہی ہے وہ عمل کہ جس کے نتیجے میں اظہارِ دین حق جزیرہ نمائے عرب کی حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ملکِ عرب کی حد تک مکمل ہو گیا۔

فَصَلَّى اللّٰهُ عليه وعلى آله وصحبه وسلم تسليما كثيرا كثيرا

انقلابِ نبویؐ کے
بین الاقوامی مرحلے کا آغاز

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ صدق اللہ العظیم

خاتم النبیین اور آخر المرسلین ہونے کی حیثیت سے آنحضور ﷺ پر نبوت و رسالت کا صرف اختتام ہی نہیں ہوا بلکہ اتمام و کمال بھی ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ ایک بعثتِ خصوصی اہل عرب اور ایک بعثتِ عمومی پوری نوعِ انسانی کی طرف اگرچہ نظری طور پر تو یہ بھی ممکن تھا کہ آنحضور ﷺ اپنی ان دونوں بعثتوں کے ضمن میں اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی کا آغاز بیک وقت فرما دیتے یعنی جیسے ہی آپؐ نے مکہ مکرمہ میں اپنی رسالت کا دعویٰ ظاہر فرمایا اُسی وقت آپؐ امراء و سلاطین کے نام بھی خطوط ارسال فرما دیتے لیکن آپؐ نے اپنی دعوت و تبلیغ میں جس حکمت اور جس تدریج کو پیش نظر رکھا اُس کا یہ نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ ۶ھ تک جبکہ صلح حدیبیہ واقع ہوئی اور گویا کہ اہل عرب نے نبی اکرم ﷺ کی قوت کو تسلیم کر لیا' آنحضور ﷺ نے اپنی تمام تر توجہات اندرون ملک عرب مرتکز رکھیں اور بیرونِ ملک عرب اپنی کسی دعوتی کوشش کا آغاز نہیں فرمایا البتہ صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ نے دعوتی نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے قیصر روم کے نام بھی' کسریٰ فارس کے نام بھی اور آس پاس کی دوسری چھوٹی حکومتوں' جیسے مقوقس شاہِ مصر' نجاشی شاہِ حبشہ' روسائے یمامہ اور روسائے شام' کے نام بھی۔ یہ بات واضح رہے کہ روم اور فارس کو گویا اس وقت کی دو سپر پاورز کی حیثیت حاصل تھی۔ آنحضور ﷺ کی اصل اہم سفارتیں انہی دو سلطنتوں کی طرف ارسال

ہوئیں۔ حضرت دحیہ کلبیؓ قیصر روم کے دربار میں اور حضرت عبداللہؓ بن حذافہ سہمی کسریٰ کے دربار میں بھیجے گئے قیصر اور کسریٰ کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے بالکل متضاد سامنے آیا۔ قیصر عیسائی تھی' صاحب علم تھا وہ جانتا تھا کہ نبی آخر الزماں کے ظہور کا وقت قریب ہے۔ اُس نے نامۂ مبارک کی بھی قدر کی اور آپ کے سفیر کی بھی عزت افزائی کی بلکہ ہمیں تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک بھرپور کوشش کی کہ کسی طرح پوری سلطنت اُسی طرح اسلام قبول کر لے جیسے ماضی میں پوری سلطنت روما نے عیسائیت کو اختیار کیا تھا۔ تاکہ اُس کی بادشاہت اور حکومت کو کوئی گزند نہ پہنچے لیکن افسوس وہ اس میں ناکام رہا اور یہی بادشاہت اور یہی سیادت اور دنیوی اقتدار اُس کے پاؤں کی بیڑی ثابت ہوا اور وہ ایمان سے محروم رہ گیا۔ اس کے برعکس رویہ سامنے آیا' کسریٰ کا اُس نے نامۂ مبارک کو چاک کر دیا اور نہایت غیظ و غضب کے عالم میں اپنے یمن کے گورنر بازان کو یہ حکم بھیجا کہ محمد کو گرفتار کر کے (ﷺ)' ہمارے دبار میں پیش کیا جائے۔ حضور ﷺ نے اس پر یہ تبصرہ فرمایا کہ کسریٰ نے میرا خط چاک نہیں کیا بلکہ اپنی سلطنت کے پرزے کر دیے ہیں'' جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے دور میں یہ پیشین گوئی فی الواقع پوری ہوئی۔ اسی طرح مقوقس شاہِ مصر کی طرف سے بھی ہرقل قیصر روم ہی کا سا طرزِ عمل سامنے آیا بلکہ اُس نے حضور ﷺ کے نامۂ مبارک کی تکریم بھی کی اور ہدایا بھی حضور ﷺ کی خدمت میں ارسال کیے۔ نجاشی والئ حبشہ پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ الغرض نبی اکرم ﷺ کی دعوت و تبلیغ کا دائرہ اس طرح ملک عرب سے نکل کر اطراف و جوانب کی طرف وسعت اختیار کر گیا۔

اسی ضمن میں یہ واقعہ پیش آ گیا کہ روسائے شام میں سے ایک شخص شراجیل بن عمر نے نبی اکرم ﷺ کے سفیر حضرت حارث ابن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ یہ تھا وہ واقعہ جس کے نتیجے میں قصاص کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ایک جبش روانہ فرمایا اور یہ گویا کہ تمہید ہو گئی سلطنت روما کے ساتھ ایک مسلح تصادم کی۔ چنانچہ تین ہزار کا ایک لشکر نبی اکرم ﷺ نے حضرت زید ابن حارثہؓ کی سرکردگی میں اس قتل کے قصاص کے لیے روانہ کیا ادھر سے

شراجیل بن عمر ایک لاکھ کا لشکر لے کر چلا۔ جب حضرت زید ابن حارثہ ؓ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ تین ہزار اور ایک لاکھ کے مابین ظاہر ہے کہ کسی مقابلے کا کوئی سوال نہیں تھا! لیکن صحابہ کرام ؓ نے اس بات کو سامنے رکھا کہ ہم تو اصل میں شہادت کے طلب گار ہیں ہمارے لیے فتح یا شکست بے معنی ہے۔ ہمیں تو جامِ شہادت نوش کرنا ہے۔ چنانچہ موتہ کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ حضرت زید ابنِ حارثہ ؓ شہید ہوئے۔ حضور ﷺ کے حکم کے مطابق اُن کے بعد حضرت جعفر طیار ؓ نے علم سنبھالا۔ وہ بھی شہید ہوئے اور اُن کے جسم پر زخموں کو گنا گیا تو ۹۰ زخم تھے۔ اُن کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری ؓ نے علم سنبھالا وہ بھی شہید ہوئے ان کے بعد حضرت خالد بن ولید ؓ نے کمان سنبھالی جنہیں حضور ﷺ نے اسی معرکے میں صحابہ ؓ کو کامیابی سے دشمن کے نرغے سے بچالانے پر سَیْفٌ مِنْ سُیُوْفِ اللّٰہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اگرچہ مقابلہ تو بہر حال نہیں ہوسکتا تھا اور عام معنی میں فتح حاصل ہونی عقلاً محال تھی لیکن حضرت خالد بن ولید ؓ نے کمالِ تدبیر کے ساتھ اپنے لشکر کو غنیم کے نرغے سے نکال لیا اور واپس تشریف لے آئے۔ جنگ موتہ جو ۸ھ جمادی الاولیٰ کے مہینے میں ہوئی ہے۔ یہ گویا کہ پہلا مسلح تصادم تھا نبی اکرم ﷺ کی قائم کردہ اسلامی ریاست کا وقت کی ایک عظیم مملکت 'سلطنت روما' کے ساتھ۔

اس کے بعد کچھ خبریں ملنی شروع ہوئیں کہ رومی فوجیں جمع کر رہے ہیں اور حملے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ غسان کے تمام قبائل مجتمع ہوکر مدینہ منورہ کی طرف پیش قدمی کے نقشے بنا رہے ہیں تو نبی اکرم ﷺ نے خود اپنی طرف سے اقدام فرمانے کے لیے تمام مسلمانوں میں ایک نفیر عام کا اعلان کروادیا یہ وقت گویا کہ بڑا ہی نازک تھا۔ سلطنت روما کے ساتھ ٹکراؤ کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ سلطنت کہ جس کے پاس لاکھوں کی standing armies موجود تھیں جن کی فوجیں پوری طرح تربیت یافتہ اور قواعدِ حرب سے پورے طور پر آگاہ اور ہر طرح کے اسلحہ سے پورے طور پر مسلح تھیں' اُن کے ساتھ تصادم کا مرحلہ درپیش تھا چنانچہ نفیر عام ہوئی کہ ہر صاحبِ ایمان کو اس معرکے میں

شرکت کے لیے نکلنا ضروری ہے۔ حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں صرف اسی موقع پر نفیر عام ہوئی جسے غزوۂ تبوک یا سفر تبوک کا نام دیا گیا ہے جو ۹ھ میں پیش آیا۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب کہ شدید گرمی کا موسم تھا۔ ایک طویل مسافت طے کرنی تھی۔ سلطنتِ روما سے ٹکراؤ تھا۔ قحط کی کیفیت تھی۔ اجناس کی کمی تھی۔ رسد ساتھ لے جانے کے لیے موجود نہ تھی۔ اُس وقت اہل نفاق کا نفاق پوری طرح نمایاں ہوکر سامنے آیا۔ چنانچہ سورۃ التوبۃ میں جہاں اس وقت کے حالات پر بڑا بھرپور تبصرہ ہے۔ منافقین کی طرف سے اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا۔ اس کا پورا ذکر موجود ہے۔ الغرض اہل ایمان نے پورے صبر اور ثبات کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی پکار پر لبیک کہا۔ تیس ہزار صحابہ کرام کا لشکر لے کر نبی اکرم ﷺ نے تبوک کی طرف کوچ کیا جس میں دس ہزار کا رسالہ بھی شامل تھا۔ حضور سرحد شام پر پہنچ کر تبوک کے مقام پر قیام پذیر ہوئے اور بیس دن تک حضور ﷺ وہاں قیام فرما رہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہرقل ''قیصر روم'' نے مقابلے سے پہلوتہی اختیار کی اور اُس کا سبب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ علم تھا اور حضرت مسیح علیہ السلام کا نام لیوا' آسمانی کتابوں کو جاننے والا تھا۔ وہ پہچان چکا تھا کہ محمد ؐ اللہ کے رسول ہیں (ﷺ) تو گویا کہ یہ بات اس کے سامنے بالکل واضح تھی کہ اللہ اور رسول ؐ سے مقابلے کرنے کے معنی یقینی شکست کے ہیں لہٰذا وہ پہلوتہی کرتا رہا' طرح دیتا رہا' مقابلے میں نہ آیا حالانکہ اُس کے پاس لاکھوں کی تعداد میں مسلح فوج موجود تھی۔ تبوک میں حضور ﷺ بیس دن تک قیام فرما رہے۔ آس پاس کے رئیس اور آس پاس کے جو بھی قبائل تھے ان کے سردار آ کر حضور ﷺ کے ساتھ اطاعت کا عہد و پیمان کرتے رہے اور اس طرح عرب کی جو ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی تھی۔ اسے گویا کہ جزیرۂ نما عرب میں پورا استحکام حاصل ہو گیا۔ اس کا رعب پورے عرب پر چھا گیا اور اس کی دھاک' اطراف و جوانب پر بیٹھ گئی اور نبی کریم ﷺ بغیر کسی مسلح تصادم کے مدینہ تشریف لے آئے۔

اس کے بعد اپنے مرضِ وفات میں نبی اکرم ﷺ نے پھر ایک جیش تیار کر دیا تھا۔ جس کی سرکردگی حضرت زید ؓ ابن حارثہ کے فرزند حضرت اسامہ ؓ ابن زید کو دی گئی تھی۔ یہ

ہے درحقیقت تمہید اُس تصادم کی جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دنیوی کے آخری دور میں وقت کی دو عظیم ترین سلطنتوں کے ساتھ جس کا آغاز ہو گیا تھا اور یہی بعد میں خلافتِ راشدہ کے دوران اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

۹ھ میں نبی اکرم ﷺ نے حج کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج کی حیثیت سے متعین فرما کر روانہ کیا۔ لیکن جبکہ حضرت ابوبکرؓ روانہ ہو چکے تھے سورۃ التوبۃ کی ابتدائی آیات نازل فرمائیں۔ گویا کہ حضور ﷺ کو حکم دے دیا گیا کہ اعلان کر دیا جائے اس حج کے موقع پر تمام مشرکین کے لیے عرب کے تمام وہ لوگ جو شرک پر کاربند رہنا چاہیں۔ وہ کان کھول کر سن لیں کہ اب ان کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی معاہدہ نہیں ہے۔ اور ان سے کامل براءت ہے:

﴿بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١﴾ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢﴾ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ﴾

''اعلانِ براءت ہے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اعلان عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی''۔

اب اُن کو آخری الٹی میٹم دیا جا رہا ہے کہ چار مہینوں کی مدت کے ختم ہونے کے فوراً بعد اُن کے خلاف عام اقدام شروع کر دیا جائے گا۔ اب یا وہ اسلام قبول کریں اور اگر کفر اور شرک پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو جزیرہ نمائے عرب کو خیر باد کہہ کر جہاں سینگ سمائیں چلے جائیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علیؓ یہ اعلانِ عام کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور ۹ھ کے

حج موقع پر یہ اعلانِ عام ان قبائل کے وفود کے سامنے کر دیا گیا ہو جو حج کے لیے آئے ہوئے تھے۔

۱۰ھ میں اب بنفس نفیس تشریف لاتے ہیں محمد رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے لیے اس حج کے موقع پر معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے کونے کونے سے سوا لاکھ کے قریب صحابہ کرامؓ جمع ہوئے گویا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تیئیس برس کی محنتِ شاقہ کا حاصل میدانِ عرفات میں جمع ہو گیا۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے عرفات میں بھی خطبہ دیا' منیٰ میں بھی خطبے ارشاد فرمائے اور ان ہی خطبات کو یکجا کر کے خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس میں ایک جانب تو حضور ﷺ نے ابتدا ہی میں اپنے وصال کی خبر دے دی کہ:

''لوگو شاید کہ دوبارہ اس مقام پر ملنا نصیب نہ ہو''۔

اُس کے بعد آپؐ نے اپنی تعلیمات کو finishing touches دیے اہم چیزوں کا دوبارہ اعادہ کیا۔ اُسی کے ضمن میں آپؐ نے فرمایا:

''پوری نوع انسانی سماجی اعتبار سے بالکل برابر ہے کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کوئی فضیلت نہیں۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر کسی عجمی کو کسی عربی پر کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت نہیں''۔

یہ وہ چیز ہے جس کا بالخصوص ذکر ہوتا ہے ایچ جی ویلز اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ یہ اصول جو محمد عربیؐ نے بیان فرمایا' یہ محض ایک وعظ نہیں تھا واقعتاً محمدؐ نے (ﷺ) ان ہی اصولوں پر ایک معاشرہ بالفعل قائم کر دیا۔

خطبے کے آخر میں اب حضور ﷺ نے ان لوگوں سے ایک سوال کیا:

اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟

''لوگو! میں نے پہنچا دیا یا نہیں''۔

اور مجمع عام نے بیک زبان یہ جواب دیا:

اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ

''ہاں! حضور ﷺ! ہم گواہ ہیں۔ آپ نے حق تبلیغ ادا کر دیا۔ حق امانت ادا کر دیا

حق نصیحت ادا کر دیا‘‘۔

حضور ﷺ نے تین مرتبہ سوال کیا اور تین ہی مرتبہ پورے مجمع نے یہی جواب دیا اوراس کے بعد آپ ؐ نے تین مرتبہ انگشت شہادت سے اشارہ کیا: آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اشارہ پہلے آسمان کی طرف اور پھر لوگوں کی طرف:

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ

’’اے اللہ تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ تو بھی گواہ رہ۔ اے اللہ تو بھی گواہ رہ‘‘

یہ گویا عملی تفسیر ہے سورۃ الفتح کی اس آیت کے آخری حصہ کی:

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ ط وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا﴾

’’وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول ؐ کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے‘‘۔

اس کے بعد آپ ؐ نے آخری بات فرمائی: ’’مسلمانو! میرا کام ابھی مکمل نہیں ہوا‘‘ بقول علامہ اقبال مرحوم:

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

پورے عالم انسانیت تک اس پیغام کو پہنچانا اب تمہارے ذمے ہے:

فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ

’’اب چاہیے کہ پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں ان کو جو یہاں موجود نہیں ہیں‘‘۔

فَصَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا

انقلاب دشمن طاقتوں کا خاتمہ

خلافتِ صدیقی رضؓ

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ﴿۱﴾ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ ط اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾﴾ صدق اللہ العظیم

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری چار سالوں کے دوران یعنی صلح حدیبیہ کے بعد آنحضور ﷺ کی جدوجہد نے واضح طور پر دورخ اختیار کر لیے یعنی ایک طرف آپ ؐ کی بعثت خصوصی ’’اِلٰی اَھْلِ الْعَرَب‘‘ کے مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں پورے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کا بالفعل قیام اور نفاذ اور دوسری طرف آپ ؐ کی بعثتِ عمومی ’’اِلٰی کَآفَّۃِ النَّاسِ‘‘ کے مقاصد کی تکمیل کے ضمن میں پیغامِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تبلیغ تمام اقوام وملل اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا غلبہ اور اس کے لیے سعی وجہد کا آغاز۔

حجۃ الوداع کو اس ضمن میں ایک ’land mark‘ کی حیثیت حاصل ہے اس موقع پر ایک طرف یہ بات بالکل ظاہر ہوگئی کہ اب پورے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کا دین فیصلہ کن طور پر غالب ہو چکا ہے اور دوسری جانب نبی اکرم ﷺ نے اپنی بعثتِ عامہ کے فرائض کی تکمیل کے لیے ساری ذمہ داری اُمت کے حوالے فرما دی یہ حکم دے کر کہ:

فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ

’’اب پہنچائیں اس پیغام کو وہ لوگ جو یہاں ہیں اُن سب لوگوں کو جو یہاں موجود نہیں ہیں‘‘۔

حجۃ الوداع سے واپسی کے فوراً بعد ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نبی اکرم ﷺ کی روحِ مبارک اس عالمِ ناسوت میں مزید قیام کے لیے بالکل تیار نہ ہو اور اس پر رفیق اعلیٰ کی جانب مراجعت کا جذبہ شدت سے غالب آ چکا ہو چنانچہ حج کے بعد آپ ؐ کی حیاتِ دُنیوی کے کل ۸۰ یا ۹۰ دن ہیں۔ اس لیے کہ مختلف روایات کی رو سے ۱۸۔۱۹ یا ۲۸ یا ۲۹ صفر المظفر ۱۳ھ کو نبی اکرم ﷺ کے مرضِ وفات کا آغاز ہو گیا اور ۲ یا ۳ یا ۱۲ یا ۱۳ ربیع الاول کو نبی اکرم ﷺ کی روحِ مبارک نے آپ ؐ کے جسدِ عنصری سے پرواز کر لی۔ آخری ایام میں بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا کہ آپ ؐ پر اب اس دنیا میں جو بھی لمحہ گزر رہا ہے بڑا شاق گزر رہا ہے۔ چنانچہ اپنے مرضِ وفات کے دوران آپ ؐ نے خطبہ بھی ارشاد فرمایا جب ذرا افاقہ ہوا اور آپ ؐ اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ؐ کے حکم کے مطابق امامت فرما رہے تھے اور صحابہ کرام ؓ اُن کی امامت میں نماز ادا فرما رہے تھے۔ حضور ﷺ تشریف لائے حضرت ابوبکر نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن حضور ﷺ نے اشارے سے انہیں حکم دیا کہ نماز جاری رکھو اور حضرت ابوبکر ؓ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد آپ ؐ نے خطبہ ارشاد فرمایا:

''اللہ نے اپنے ایک بندے کو یہ اختیار دیا کہ وہ چاہے تو دنیا کی نعمتیں قبول کر لے اور چاہے تو جو کچھ اُس کے پاس ہے یعنی عالمِ اخروی کی نعمتیں انہیں اختیار کر لے تو بندے نے جو کچھ رب کے پاس ہے' اسے قبول کر لیا''۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے اس لیے کہ انہیں اندازہ ہو گیا کہ درحقیقت نبی اکرم ﷺ یہ خود اپنی بات فرما رہے ہیں اور آپ ؐ نے ہم سے جدائی اور رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا وصال یقیناً اُمت مسلمہ کے لیے اور بالخصوص صحابہ کرام ؓ کی جماعت کے لیے ایک انتہائی رنج و غم اندوہ اور صدمے کی بات تھی لیکن ظاہر ہے کہ نبی اکرم ﷺ جو مشن اُمت کے حوالے کر گئے تھے اس کی تکمیل نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے جو نظمِ جماعت قائم فرمایا تھا اب اس کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ کتنا پختہ نظمِ جماعت تھا کہ فوراً ہی

مشوروں سے تمام مراحل طے پا گئے اور نبی اکرم ﷺ نے جنہیں نماز کی امامت کے لیے آگے بڑھایا تھا اور جنہوں نے ۱۷ نمازیں حضور ﷺ کی حیات کے دوران مسلمانوں کو امام بنا کر پڑھائی تھیں انہی کی خلافت پر اُمت کا اجماع ہو گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق بلاشبہ صدیق اکبر ہیں رضی اللہ عنہ۔ اور یہ جان لینا چاہیے کہ مقامِ صدیقیت مقامِ نبوت سے بہت قرب رکھتا ہے بلکہ شیخ احمد سرہندی ؒ المعروف بہ مجدد الف ثانی ؒ کا قول تو یہ ہے کہ ''حقیقت صدیقی ظلِ حقیقت محمدی است''۔ مقامِ صدیقی درحقیقت مقامِ نبوت کا ظل اور سایہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کل ڈھائی سالہ خلافت کے دوران نبی اکرم ﷺ جزیرہ نمائے عرب میں جس انقلاب کی تکمیل فرما گئے تھے اس کے از سرِ نو استحکام کا عمل بہ تمام و کمال پورا ہوا۔ تاریخ عالم میں جتنے انقلابات آئے ہیں ان سب میں آپ کو ایک بات قدرِ مشترک کے طور پر ملے گی کہ انقلاب جب اپنے آخری مراحل میں ہوتا ہے اس وقت انقلاب دشمن طاقتیں کونوں اور کھدروں میں دبک جایا کرتی ہیں اور منتظر رہتی ہیں کہ پھر جب بھی موقع ہو وہ سر اٹھائیں اور انقلاب پر حملہ آور ہوں اور اسے ناکام کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہی عمل ہے جو نبی اکرم ﷺ کے وصال کے فوراً بعد ہمیں جزیرہ نمائے عرب میں ہر چہار طرف نظر آتا ہے۔ ایک سماں یہ تھا کہ فرمایا گیا:

﴿وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ﴿۲﴾﴾

''اے نبی ؐ! آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ داخل ہو رہے ہیں اللہ کے دین میں فوج در فوج''۔

لیکن حضور ﷺ کے انتقال کے بعد عارضی طور پر منظر یہ سامنے آیا کہ:

یَخْرُجُوْنَ مِنْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا

کا سا معاملہ ہو گیا۔

لوگ فوج در فوج اللہ کے دین سے نکلنے لگے ایک جانب نبوتِ کاذبہ کے دعوے دار' جھوٹے مدعیانِ نبوت کھڑے ہو گئے اور اُن کی دعوت پر بھی لاکھوں کی تعداد میں

لوگوں نے لبیک کہا۔ دوسری طرف ایک کثیر تعداد میں لوگ زکوٰۃ سے انکار کر کے کھڑے ہو گئے کہ ہم توحید کی گواہی دیں گے، ہم رسالت کی گواہی دیں گے، نماز بھی قائم کریں، لیکن زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے۔

حضرت ابوبکرؓ بظاہر بہت ہی رقیق القلب انسان تھے آپؓ کا جسم بھی بہت ہی نحیف و نزار لیکن اس موقع پر یہ حقیقت سامنے آئی کہ اس بظاہر کمزور شخصیت کے اندر ہمت اور صبر و استقامت اور ثبات کا ایک کوہ ہمالیہ مضمر ہے۔ چنانچہ آپؓ نے بیک وقت ان تمام فتنوں سے مقابلہ فرمایا حالانکہ بہت سے حضرات نے آپؓ کو مشورہ دیا کہ کم سے کم مانعین زکوٰۃ کے معاملے میں حکمت عملی کو مدنظر رکھتے ہوئے فی الوقت کسی قدر نرمی سے کام لیا جائے۔ لیکن ابوبکرؓ صدیق نے فرمایا کہ میں اللہ کے رسولؐ کا جانشین ہوں انا خَلِيفَةُ رَسُولِ اللّٰهِ۔ اور اللہ کے رسولؐ ہمیں جو دین دے کر گئے ہیں اس میں اگر سرِ مو بھی فرق کرنے کی کوشش کی گئی تو اور کوئی ساتھ دے یا نہ دے ابوبکرؓ تن تنہا سب کا مقابلہ کرے گا۔ یہاں تک کہ آپؓ نے فرمایا کہ ''یہ تو زکوٰۃ کا انکار کر رہے ہیں اگر ایسا بھی ہو کہ حضور ﷺ کے زمانے میں اگر زکوٰۃ کے اونٹوں کے ساتھ اُن کی رسیاں بھی آتی ہوں اور اب لوگ اونٹ دینا چاہیں لیکن رسیاں نہ دینا چاہیں تو میں اُن سے بھی قتال کروں گا''۔

یہ ہے وہ عزیمت، یہ ہے وہ صبر و ثبات کہ جس کا مظاہرہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا قیام ابھی اس عالمِ ناسوت میں کچھ عرصے اور رہتا تو بہت اچھا ہوتا۔ آپؐ اپنے انقلاب کے خلاف اٹھنے والی ان تمام مخالفانہ قوتوں (reactionary forces) کا بھی بنفس نفیس خود اپنے دستِ مبارک سے استیصال فرما جاتے اور انقلاب کو از خود استحکام بخش کر پھر مراجعت فرماتے رفیق اعلیٰ کی طرف۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حکمت خداوندی میں کچھ اور ہی پیش نظر تھا چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے اس مقام و مرتبے کا اظہار ہرگز نہ ہو پاتا اگر یہ پوری صورت حال اس طرح پیش نہ آتی جیسی کہ فی الواقع پیش آئی کہ حضرت ابوبکرؓ ان تمام

فتنوں کا استیصال فرماتے اور ان تمام انقلاب دشمنوں کا سر کچل کر انقلاب محمدیؐ کو از سر نو مستحکم کرتے۔ کل ڈھائی ہی سالوں میں آپؓ نے اپنے رفیق غارؐ کے انقلاب کو مستحکم کیا اور پھر اللہ کی طرف مراجعت اور اپنے رفیق غار اپنے محبوب اپنے رسولوں کے پہلو میں تا قیام قیامت استراحت فرمائی۔

دوسری جانب چونکہ خلافت راشدہ درحقیقت نبوی مشن کی تکمیل کا ذریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ سے لوگوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ آپ خلیفۃ اللہ ہیں یا خلیفۃ المسلمین تو انہوں نے فرمایا کہ مَیں تو خلیفۃ رسول اللہ ہوں۔ خلافت راشدہ کو اسی وجہ سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔ نبوت کے نقش قدم پر خلافت۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت عامہ یعنی آپؐ کے رسالت کے مقاصد میں سے جس مقصد کا تعلق پورے عالم ارضی سے تھا اس تکمیل کے لیے جس عمل کا آغاز نبی اکرم ﷺ نے بنفس نفیس فرمایا تھا اس عمل کو بھی ابوبکرؓ صدیق نے آگے بڑھایا۔

جیشِ اسامہؓ کا معاملہ اس معاملے میں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ اُن کے بارے میں بھی بہت سے حضرات نے مشورہ اور پر خلوص مشورہ دیا کہ فی الوقت اندرون ملک عرب اتنے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں کہ اگر آپؓ صرف ان سے نبرد آزما ہو جائیں اور عہدہ برآ ہو جائیں تو بہت کافی ہے سر دست اس لشکر کی روانگی ملتوی فرما دیجیے۔ لیکن یہاں بھی وہ صدیق اکبرؓ اسی عزیمت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ جس لشکر کی روانگی کا فیصلہ محمد رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا اُس کی روانگی تو مؤخر کرنے والا میں کون ہوں! یہ تو پھر خلافت کا تقاضا نہ ہوا۔ یہ تو حضور ﷺ کے کیے ہوئے فیصلوں کی ایک reverte ہے۔ ان میں ترمیم ہو جائے گی۔ چنانچہ جیش اُسامہ ؓ کو روانہ کیا گیا۔ اور اس فیصلہ کو بھی قائم رکھا گیا کہ اس کی سرکردگی حضرت اسامہ ؓ کو دی گئی حالانکہ وہ بالکل نوجوان تھے۔ اس پر بھی جب یہ کہا گیا کہ ذرا اس فیصلے میں ترمیم کر لیجیے تو پھر اس جانشین رسول کا وہی قول سامنے آیا کہ جس کو علَم سنبھلوایا ہو محمد رسول اللہ ﷺ نے مَیں اُس کے ہاتھ سے علَم لینے والا کون ہوتا ہوں!

حضرت اسامہؓ جب لشکر کو لے کر چلے ہیں اور اُن کے ساتھ ساتھ خلیفۂ وقتؓ پیدل چلے اور جب حضرت اسامہؓ احتراماً سواری سے اترنے لگے تو منع فرما دیا۔ یہ ہے شان حضرت ابوبکرؓ کی اور یہ ہے درحقیقت مقام اور مرتبۂ خلافتِ صدیقی کا۔

ایک اور بہت بڑا احسان جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اُمت مسلمہ پر وہ ہے، قرآن مجید کا جمع کرنا۔ جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ تک معروف معنی میں ایک کتاب کی شکل میں جمع نہ تھا یعنی ''مابین الدفتین''۔ جیسے ایک کتاب ہوتی ہے۔ جلد کے دو گتوں کے مابین۔ صفحات میں مرتب صورت میں لکھی ہوئی۔ اگرچہ ترتیب کا حکم حضور ﷺ نے دے دیا تھا۔ ترتیب آپؐ نے قائم فرما دی تھی۔ آیات کو جمع کر کے سورتوں کی شکل دینا اور سورتوں کا باہمی نظم اور ربط یہ آنحضور ﷺ نے خود کر دیا تھا۔ لیکن ابھی کسی کے پاس کچھ سورتیں تھیں لکھی ہوئی، کسی کے پاس کچھ اور دوسری سورتیں تھیں کہیں کپڑے پر لکھی ہوئی کہیں ہڈیوں پر لکھی ہوئی، کہیں کاغذوں پر لکھی ہوئی اور سب سے بڑھ کر لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھا، قرآن مجید۔ لیکن جب حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں بہت سی جنگیں ہوئیں اور ان میں بہت سے صحابہؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا تو اُن میں خصوصاً جنگ یمامہ میں بہت سے حفاظ شہید ہو گئے تب یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن ایک مصحف کی صورت میں محفوظ کیا جائے۔ اس خیال کو سب سے پہلے ظاہر کرنے والے ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہ قرآن مجید کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کر لیا جائے ایسا نہ ہو کہ حفاظ کی کثیر تعداد شہید ہو جائے اور کہیں قرآن مجید کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ کہ:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر)

''ہم نے ہی اس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت فرمانے والے ہیں۔''

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیق کے ہاتھوں اس ارادۂ خداوندی کی تعمیل ہوئی۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو جو حضور ﷺ کے زمانے میں کاتب وحی

تھے، حکم دیا کہ وہ قرآن مجید کو جمع کریں۔ وہؓ یہ فرماتے ہیں کہ مجھے اگر کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی خدمت سپرد کی گئی ہوتی تو وہ بھی مجھ پر اتنی بھاری نہ ہوتی جتنا بوجھ میں نے اس ذمہ داری کا محسوس کیا۔ بہرحال نبی اکرم ﷺ کو اپنے حجۃ الوداع میں تو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ:

وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا كِتَابُ اللّٰهِ

''اور یقیناً میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کا سرشتہ اگر مضبوطی سے تھامے رہو گے تو ابد آلاباد تک گمراہ نہ ہوسکو گے اور وہ چیز ہے کتاب اللہ''۔

یعنی اے میری اُمت میں جا رہا ہوں لیکن تمہیں بے سہارا بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا رہا بلکہ چھوڑ چلا ہوں تمہارے مابین وہ چیز کہ جسے اگر مضبوطی سے تھام لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ کتاب اللہ ہے۔ تو یہ بھی مقام صدیقیت اور مقامِ نبوت کے باہمی اتصال کا ایک مظہر ہے کہ اس کتاب کو بین الدفتین کی شکل دی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کتاب الٰہی سے صحیح تمتع کی توفیق عطا فرمائے۔

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدِ نِ الْاَمِيْنِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

انقلابِ نبوی کی توسیع

خلافتِ فاروقیؓ و عثمانیؓ

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ﴾ (النور:۵۵)

''اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اُسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے اور ان کے اُس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے''۔

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بالکل بجا طور پر اس رائے کا اظہار فرمایا ہے کہ خلافتِ راشدہ درحقیقت نبوت محمدیؐ کا تتمہ ہے' علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام' اور یہ بات اس لیے بالکل قرین قیاس ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی جو بعثتِ عامہ ہے یعنی آپؐ کی بعثت پوری دنیا کی طرف' تمام عالمِ انسانی کی طرف۔ اُس کے فرائض کی تکمیل خلافتِ راشدہ کے ذریعے ہوئی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے جس عمل کا آغاز بنفس نفیس فرما دیا تھا یعنی آنحضور ﷺ نے اپنے دعوتی نامہ ہائے مبارک ارسال فرمائے۔ پھر غزوۂ موتہ' پھر سفر تبوک کے مراحل درپیش ہوئے اور پھر جیش اُسامہ کی تیاری اور اس کی روانگی کے انتظام سے جس عمل کا آغاز ہوا۔ جسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں آگے بڑھایا۔ چنانچہ مسلمانوں کی پیش قدمی شام کے ملک میں آپ کے دورانِ

خلافت بھی کافی حد تک ہو چکی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی فتوحات کا سیلاب جس کو بجا طور پر تعبیر کیا ہے علامہ اقبال نے اس طرح کہ: ع

رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

یہ نقشہ عہد خلافت فاروقی اور عہد خلافت عثمانی میں ہمارے سامنے آتا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کی مدت کل دس سال ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارہ سالوں میں سے پہلے دس سالوں کی شان بالکل وہی ہے جو خلافتِ فاروقی کی تھی۔ وہی اتحاد' وہی یک جہتی' وہی ذوقِ جہاد' وہی جوشِ عمل' وہی شوقِ شہادت جو ہمیں دورِ نبویؐ میں اور عہد صدیقیؓ میں نظر آتا ہے۔ ان بیس سالوں کے دوران یعنی خلافتِ فاروقی و عثمانی میں بھی بتمام وکمال نظر آتا ہے۔ البتہ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کے آخری دو سالوں میں افتراق اور انتشار بھی ہوا اور فتنہ وفساد کی شکل بھی سامنے آئی ہے جس کے اسباب پر اس وقت گفتگو کو موقع محل نہیں۔ بہرحال یہ عمل جو تقریباً ایک ربع صدی تک جاری رہا ہے اور نہایت آب وتاب کے ساتھ جاری رہا ہے۔ اس کے بارے میں ایک بات تو یہ جان لینی چاہیے کہ اس کی اصل غرض و غایت کشور کشائی نہ تھی۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

یہ عام دُنیوی فتوحات' یا دوسرے فاتحین کی دنیا میں پیش قدمی سے بالکل ایک مختلف معاملہ ہے۔ چنانچہ جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے' جو فاتح ایران ہیں' ایرانیوں کی جانب سے یہ سوال کیا گیا آپ ہم پر کیوں چڑھ آئے ہیں؟ یہ جنگ کس لیے ہے؟ ہمارے مابین تو کوئی تنازعات بھی نہ تھے۔ تو حضرت سعدؓ نے وہ جواب دیا جو تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے اور جو تا قیامِ قیامت روشن وتاباں رہے گا۔ انہوںؓ نے ایرانیوں کے سوال کے جواب میں کہا:

اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمٰتِ الْجَهَالَةِ اِلٰى نُوْرِ الْاِيْمَانِ وَمِنْ

جَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰی عَدْلِ الْاِسْلَامِ

ہم بھیجے گئے ہیں یعنی میں آیا نہیں لایا گیا ہوں۔ ہم خود نہیں آئے ہم ایک مشن پر ہیں اور وہ مشن کیا ہے کہ ہم نوعِ انسانی کو جہالت سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لائیں اور بادشاہوں کے ظلم وستم کے پنجے سے نجات دلا کر اسلام کے عدل سے روشناس کریں۔ چنانچہ یہ وہی بات ہے کہ اصل مقصد شہادتِ حق تھا۔ شہادت کے ایک معنی اللہ کی راہ میں گردن کٹوا دینے کے بھی ہیں اور اس طرح گویا کہ یہ ہر مجاہد فی سبیل اللہ کا ایک انفرادی نصب العین ہے۔ یہ وہ تمنا ہے کہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ خود محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زبان پر آ رہی ہے چنانچہ احادیث میں آنحضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی یہ دعائیں منقول ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ (۱)

''اے اللہ میں تجھ سے اپنے راستہ میں شہادت کا طلبگار ہوں''۔

اور

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَۃً فِیْ سَبِیْلِکَ (۲)

''اے اللہ مجھے اپنے راستہ میں شہادت عطا فرما''

لَوَدِدْتُّ انی قاتلت فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فقتلت، ثُمَّ اُحْیِیت ثُمَّ قتلت، ثُمَّ احییت (بخاری)

''اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے کہ میری آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں پھر اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی سعادت سے شادکام ہوں۔ اور پھر زندہ کیا جاؤں......''

یہ بات دوسری ہے کہ اپنے رسولوں کے بارے میں اللہ کی سنت یہ ہے' اس کا یہ

(۱) دستیاب کتب حدیث میں یہ دعائیہ الفاظ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے کسی مرفوع روایت میں نہیں مل سکے۔ تاہم موطا امام مالکؒ میں یہ الفاظ حضرت عمرؓ کی دعا کے ضمن میں روایت ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو موطا امام مالكؒ، كتاب الجهاد، باب ما تكون فيه الشهادة، ح۱۰۰۶۔ (مرتب)

(۲) یہ بھی حضرت عمر فاروقؓ کی دعا کے الفاظ ہیں۔ ملاحظہ ہو صحيح البخاری، كتاب الحج، باب كراهية النبی صلى الله عليه وسلم ان تعرى المدينة، ح۱۷۹۱۔ (مرتب)

اٹل قانون ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہو سکتے:

﴿**کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ**﴾

''لازماً میں اور میرے رسول غالب رہیں گے''

اور جو مغلوب نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ وہ مقتول کیسے ہو سکتا ہے۔ چونکہ قتل مغلوبیت کی علامت ہے لہٰذا یہ خواہش حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پوری نہیں ہوئی لیکن لفظ شہید کے ایک دوسرے معنی بھی ہیں جس کی رو سے ہر رسول شہید ہے اور اس شہید کے معنی ہیں گواہ۔ اسی بات کو سورۃ النساء کی آیت ۴۱ میں واضح کیا گیا کہ عدالتِ اخروی میں تمام رسول شہید یعنی گواہ بنا کر پیش کیے جائیں گے فرمایا:

﴿**فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا**﴾

''پس سوچو کہ اس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمہیں (یعنی محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے''۔

یہ شہادت علی الناس کا فریضہ' دنیا میں حق کی گواہی دینا اپنے قول سے اور اپنے عمل سے۔ اور یہی وہ فریضہ ہے جو حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اُمت کے حوالے فرما کر اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔ چنانچہ یہ بات سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ وارد ہوئی:

﴿**وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَھِیْدًا**﴾

''اے مسلمانو! ہم نے اس طرح تمہیں ایک بہترین اُمت بنایا ہے تاکہ تم گواہی دو پوری نوعِ انسانی پر اور اللہ کے رسول گواہ ہو جائیں تم پر''۔

یہ بات سورۃ الحج میں بھی آتی ہے وہاں مسلمانوں کو للکارا جا رہا ہے اور ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ:

﴿**وَجَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ط ھُوَ اجْتَبٰکُمْ**﴾

''اور اللہ کی راہ میں محنت کرو جدوجہد کرو جیسا کہ اُس کے لیے محنت اور سعی و کوشش کرنے کا حق ہے۔ اللہ نے تمہیں چن لیا ہے''

یہ چناؤ‘ یہ انتخاب اور یہ ’’اجتبیٰ‘‘ کس مقصد اور کس غایت کے لیے کیا گیا ہے۔
اس کو اسی آیت میں آگے ان الفاظ میں واضح کیا گیا:

﴿لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ﴾

’’تاکہ رسول گواہی دے تم پر اور تم گواہی دو پوری نوعِ انسانی پر‘‘۔

چنانچہ خلافت راشدہ کے دوران ہمیں وہ نظام دینِ حق‘ وہ نظامِ عدل اجتماعی‘ انصاف وقسط کے اصول پر بالفعل قائم و نافذ نظر آتا ہے جس کی آج کے انسانوں کو اصل ضرورت ہے۔ یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ انفرادی اخلاقیات کا جہاں تک تعلق ہے سابقہ انبیاء و رسل کے ہاں بھی وہ اپنے پورے نقطۂ عروج پر ہے۔ اگرچہ اس اعتبار سے بھی ایک امتیازی شان ہے سیرت محمدی کی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کہ ہم اُس میں تمام اخلاقی اقدار کو ایک بڑے توازن اور جامعیت کے ساتھ سمویا ہوا پاتے ہیں لیکن نبی اکرم ﷺ کا اصل احسان‘ آپ کی اصل continuation وہ نظام اجتماعی ہے جس میں عدل ہے قسط ہے‘ انصاف ہے‘ ظلم سے پاک معاشرہ اور وہ نظام جو حضور ﷺ نے دیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی پوری exfoliation اس کی برکات کا یہ تمام و کمال ظہور‘ lilly in bloom نظر آتا ہے‘ دورانِ خلافتِ راشدہ میں اس لیے کہ حضور ﷺ کے عہد میں تو ابھی انقلاب کا عمل جاری تھا ابھی انقلاب تکمیل کو پہنچا ہی نہ تھا کہ حضور ﷺ نے مراجعت فرمائی۔ اَللّٰھُمَّ بِالرَّفِیۡقِ الۡاَعۡلٰی

اس نظام کی برکات ظاہر ہوئیں بالخصوص دورِ فاروقی اور دورِ عثمانی میں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف حریت ہے تو اس کا عالم یہ ہے کہ ایک خاتون بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے فرماں روا کو ٹوک سکتی ہے۔ اور ایک خاتون کی تنقید پر حضرت عمرؓ اپنا ایک آرڈی نَنس واپس لے لیتے ہیں‘ جاری شدہ حکم منسوخ فرما دیتے ہیں۔ اس طرح ایک گدڑی پوش ایک درویش بے نوا سلمان فارسیؓ برسرِ عام ٹوک دیتا ہے عمرؓ کو اور دوران خطبہ کہتا ہے:

’’لَا سَمۡعَ وَلَا طَاعَۃَ‘‘

’’نہ سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے‘‘۔

اور جب حضرت عمرؓ دریافت کرتے ہیں کہ معاملہ کیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص ایک نجی تنقید ہے یہ کرتا جو آپؓ نے پہنا ہوا ہے یہ ان چادروں سے بنا ہے جو مالِ غنیمت میں آئی تھیں اور ہر مسلمان کو جتنا حصہ ملا تھا اُس سے کرتا نہیں بنتا۔ اور آپؓ تو ہم میں ہیں طویل القامت انسان تو یہ کرتا کیسے بن گیا۔ وقت کے عظیم ترین فرماں روا پر عین مجمع عام میں یہ بالکل ذاتی تنقید ہو رہی ہے۔ آزادی کا اور حریت کا یہ عالم ہے اظہارِ رائے کی یہ کیفیت ہے اور حضرت عمرؓ وضاحت فرماتے ہیں اپنے بیٹے کو حکم دیتے ہیں کہ عبداللہ لوگوں کو اصل صورت حال بتلاؤ اور جب وہ صراحت فرما دیتے ہیں کہ میں نے اپنے حصے کا کپڑا ابھی ابا جان کو دے دیا تھا تاکہ ان کی قمیص مکمل ہو جائے۔ تو اب وہی درویش بے نوا علی الاعلان کہتا ہے:

’’اَلۡاٰنَ نَسۡمَعُ وَنُطِیۡعُ‘‘

’’ہاں اب ہم سنیں اور اطاعت کریں گے‘‘

مساوات اگر کوئی قدر ہے اور یقیناً ایک اعلیٰ قدر ہے اس کا بھی ہمیں یہ منظر آتا ہے کہ وقت کی عظیم ترین مملکت کا فرماں روا عمر فاروق رضی اللہ عنہ جس کے نام سے لرزہ طاری ہے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں میں وہ بیت المقدس کا سفر کر رہا ہے اور کس شان سے! یہ ذاتی سفر نہیں ہے۔ سرکاری فرائض کی ادائیگی کے لیے جا رہے ہیں۔ لیکن ایک اونٹ اور ایک خادم کے ساتھ۔ اور حال یہ ہے کہ ایک منزل خلیفۃ المسلمین اونٹ کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں اور غلام یا خادم آگے چل رہا ہے نکیل تھامے ہوئے۔ اور اگلی منزل میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ خادم اونٹ کی سواری کر رہا ہے اور خلیفۃ المسلمین آگے آگے پیدل چل رہے ہیں نکیل تھامے ہوئے۔ اسی طریقے سے عدل اگر حقیقتاً کسی شے کا نام ہے تو یہ بتمام و کمال نظر آئے گی اسی عہد خلافت راشدہ میں کہ مصر کے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کا بیٹا مصر میں ایک قبطی کو ناحق مارتا ہے اور وہ قبطی فریاد لے کر آتا ہے حج کے موقع پر تو حضرت عمرؓ اس قبطی سے گورنر کے بیٹے پر قصاص میں کوڑے لگواتے ہیں اور فرماتے ہیں

کہ ذرا ایک دوضربیں اس کے والد کو بھی لگاؤ۔ اس لیے کہ درحقیقت اس نے اپنے باپ کی گورنری کے زعم میں تم پر یہ ظلم کیا تھا اور وہ شخص پکار اٹھتا ہے کہ نہیں مجھے میرا بدلہ مل گیا ہے۔

حضرت علیؓ اپنی خلافت کے زمانے میں قاضی کی عدالت میں پیش ہوتے ہیں اور اُن کا دعویٰ صرف اس لیے خارج ہوجاتا ہے کہ ان کے پاس گواہیاں صرف دو تھیں۔ ایک بیٹے حضرت حسنؓ کی اور ایک غلام کی۔ اور عدالت فیصلہ کرتی ہے کہ کسی شخص کے حق میں اور اُس کے بیٹے اور اُس کے ذاتی غلام کی گواہی قبول نہیں ہوسکتی لہٰذا آپ کا دعویٰ خارج ہے۔

حریت ہو، مساوات ہو، عدل وانصاف ہو، یہ تمام اقدار کہ جن کی یوں سمجھئے کہ نوعِ انسانی کو شدید ضرورت ہے۔ ان سب کو ایک معتدل نظام کے اندر سمو کر اس عدلِ اجتماعی کو بالفعل خلافت راشدہ نے قائم کر کے اور عملاً چلا کر دکھا دیا جس کے لیے آج نوعِ انسانی تڑپ رہی ہے۔ یہ ہے وہ حجت جو خلافتِ راشدہ کے ذریعہ تاقیامِ قیامت نوعِ انسانی کے لیے قائم ہو چکی ہے۔

فَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اُمت محمدیہ ﷺ کی تاریخ کے اہم خدوخال

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ
وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا ۴ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ
اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ ط وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۵ ثُمَّ رَدَدْنَا
لَکُمُ الْکَرَّةَ عَلَیْهِمْ وَاَمْدَدْنٰکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَجَعَلْنٰکُمْ اَکْثَرَ نَفِیْرًا ۶
اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ قف وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ
لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْهَکُمْ وَلِیَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ کَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِیُتَبِّرُوْا
مَا عَلَوْا تَتْبِیْرًا ۷ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ ج وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا
جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ۸﴾ (بنی اسراء یل)

’’اور ہم نے (اُن کی) کتاب (تورات و دیگر مصحف) میں بنی اسرائیل کو اس بات پر بھی متنبہ کر دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں فسادِ عظیم برپا کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ آخر کار جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع آیا تو اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہارے مقابلے میں اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے تمہارے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا تا کہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد (بیت المقدس) میں اس طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا ربّ تم پر رحم کرے لیکن اگر تم نے اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا

کا اعادہ کریں گے اور کفرانِ نعمت کرنے والے لوگوں کو لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا رکھا ہے''۔

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((لَيَاْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ كَمَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) (ترمذی)

قرآن حکیم کے بالکل وسط میں سورۂ بنی اسرائیل واقع ہے۔ اس کے پہلے رکوع میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے چار ادوار کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فیصلے کا' جس کا اعلان ان کی کتاب (تورات و دیگر صحف) میں کر دیا گیا تھا' اظہار فرمایا ہے کہ ان پر اپنی تاریخ کے دوران دو مرتبہ عذاب الٰہی کے کوڑے برسے ہیں۔ پھر جو حدیث ابھی میں نے آپ کو سنائی۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ آنحضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

''میری اُمت پر بھی وہ تمام احوال وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر ہوئے تھے' بالکل ایسے جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے''۔

اس کی روشنی میں اگر ہم دیکھیں تو اُمت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ بھی چار ادوار میں منقسم نظر آتی ہے۔ جیسے چار ادوار بنی اسرائیل کی تاریخ میں نظر آتے ہیں' دو عروج اور دو زوال۔ ان کے عروج اوّل کا نقطہ کمال (Climax) ہے۔ حضرت طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام کا عہد حکومت۔ اس کے بعد زوال آتا ہے جو اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے ۵۸۷ء قبل مسیح میں۔ بخت نصر (جسے 'بنوکدنضر' بھی کہا گیا ہے) کے حملے کے وقت جبکہ بیت المقدس تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہیکل سلیمانی مسمار کر دیا جاتا ہے' لاکھوں یہودی قتل ہوتے ہیں' چھ لاکھ یہودیوں کو وہ اسیر بنا کر بابل (Babilonia) لے جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر ان کے عروج کا ایک دور آتا ہے جس کا سب سے بڑا مظہر سلطنت مکاوی کا ظہور ہے۔ پھر وہ اپنے دوسرے زوال سے دوچار ہوتے ہیں جس کا آغاز ہے ۸۰ء میں رومی جنرل طائٹس (Titus) کا حملہ۔ جس نے پھر بیت المقدس کو تاخت و تاراج کیا اور اس کے بعد اب تک بنی اسرائیل پستی اور زوال اور اضمحلال کا شکار ہیں۔ وقفے وقفے سے اللہ تعالیٰ کے عذاب کے کوڑے ان کی

پیٹھ پر برس رہے ہیں۔ حال ہی میں سلطنت اسرائیل کی شکل میں ذرا سا انہوں نے سانس لیا ہے لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ بھی اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ امریکہ کی شہ پر اور اسی کے سہارے سے۔ اس نقشے کو پس منظر میں رکھیے اور اب آیئے اُمت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ کی جانب۔ ہمارا عروجِ اوّل جو تقریباً ۴۰۰ سو سالوں پر پھیلا ہوا ہے یہ عروج ساتویں' آٹھویں' نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ یہ عروج عربوں کے زیر قیادت ہوا۔ یہ چار سو سال ایسے گزرے ہیں کہ زمین پر عظیم ترین مملکت' اسلامی مملکت تھی اور یہ اسلامی مملکت صرف ایک عسکری اور سیاسی قوت نہ تھی بلکہ اس میں تہذیب اور تمدن اور علوم وفنون اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچے ہوئے تھے۔ یہ ہمارا پہلا عروج ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں اس سے پہلے اتنی عظیم الشان مملکت کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ لیکن پھر ہمارا زوال آیا۔ اس زوال کا اصل سبب جان لینا چاہیے کہ اس کا سبب قرآن مجید میں بطور تنبیہہ (warning) ارشاد فرما دیا گیا تھا:

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ﴾ (محمد)

''اے محمد (ﷺ) کے ماننے والو! اگر تم نے پیٹھ موڑ لی' اُن مقاصد کی تکمیل کی بجائے جو محمد ﷺ کے امتی ہونے کی حیثیت سے تمہارے سپرد کئے گئے ہیں' اگر تم نے اپنی ذاتی منفعت' ذاتی اقتدار کو ہی مطلوب و مقصود بنا لیا اور تم بھی دنیا کے عیش میں پڑ گئے تو جان لو کہ ہماری سنت کا ظہور ہوگا۔ ہم تمہیں ہٹائیں گے کسی اور کو لے آئیں گے''۔

ظاہری اعتبار سے اسباب زوال کا خلاصہ مطلوب ہو تو وہ علامہ اقبال کے اس شعر میں موجود ہے

مَیں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

چنانچہ جب ہمارا حال بھی ''طاؤس و رباب آخر'' کی تصویر بن گیا تو ہم زوال سے دوچار ہوئے۔ عذابِ الٰہی کے کوڑے ہماری پیٹھ پر برسے۔ پہلے صلیبیوں کی شکل میں

اور پھر فتنۂ تاتار کی صورت میں ٔ پھر وہ اپنے پورے نقطۂ عروج کو پہنچ گئے ۱۲۵۸ء میں جب سلطنت یا خلافت بنی عباس کا چراغ گل ہوگیا اور عالم اسلام پورا کا پورا ایسے ضعف واضمحلال کا شکار ہوا کہ بظاہر احوال کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اسے دوبارہ بھی اٹھنا نصیب ہوگا۔لیکن پھر اُسی سنت الٰہی کا ظہور ایک عجیب شان کے ساتھ ہوا۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اللہ نے جن کو عذاب کا کوڑا بنا کر مسلمانوں کی پیٹھ پر برسایا تھا۔انہی کو ایمان و اسلام کی توفیق عطا فرمادی۔انہی کے ہاتھ میں اپنے دین کا علم تھما دیا چنانچہ یہ تین ترک قبیلے ہی تھے کہ جن کی زیر سیادت و قیادت پھر اسلام کو اپنے دوسرے عروج کا دور دیکھنا نصیب ہوا ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم مملکت قائم کی۔صفوی حکومت جو ایران میں قائم ہوئی اصلاً وہ بھی ایک ترک حکومت تھی۔ پھر سلطنت عثمانیہ (ترکی) قائم ہوئی اور پورا عالمِ عرب اور پورا شمالی افریقہ انہی کے زیر نگیں آیا اور انہی کے ہاں پھر خلافت کا احیاء ہوا۔ چوتھی بنو امیہ کی وہ سلطنت جو اندلس میں تھی۔ان چار عظیم مملکتوں کی صورت میں دنیا میں پھر مسلمانوں کی سطوت کا ڈنکا بجا۔

لیکن اس عروج کے بعد پھر زوالِ ثانی آیا۔ یہ درحقیقت یورپی استعمار کے ہاتھوں آیا۔اس کا نقطۂ آغاز پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام پر سلطنت اندلس (ہسپانیہ) کا زوال ہے۔۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد یوں سمجھئے کہ وہ سلطنت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹ گئی جس کا مرثیہ کہا ہے علامہ اقبال نے ؎

غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے

اس کے بعد ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما نے وہ راستہ تلاش کرلیا جس سے مغربی استعمار کا سیلاب عالمِ اسلام کے دائیں بازو مشرق بعید (Far East) پر حملہ آور

ہوا۔ ملایا اور انڈونیشیا کی مملکتیں اور اس کے بعد ہندوستان کی عظیم سلطنت مغربی استعمار کا نوالہ بن گئیں۔ ہماری بڑی بڑی سلطنتیں اور مملکتیں کچے گھروندوں کے مانند مغربی استعمار کے سیلاب میں بہتی چلی گئیں۔ یہ عمل اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا اس بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ٔ جبکہ پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کا یہ نقشہ سامنے آیا کہ سلطنت عثمانیہ ختم ہو گئی۔ترکی کے نام سے ایک چھوٹا سا ملک باقی رہ گیا۔ پورا عالمِ عرب مغلوب ہوگیا۔اس کے حصے بخرے کرلیے گئے۔اس کی خبر دی تھی۔ نبی اکرم ﷺ نے:

یُوْشِكُ اَنْ تَدَاعٰی عَلَیْكُمُ الْاُمَمُ......

''مسلمانو! اندیشہ ہے کہ تم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اقوامِ عالم تم پر ایک دوسرے کو ایسے دعوت دیں گی جیسے دعوتِ طعام کا اہتمام کرنے والا دسترخوان چنے جانے کے بعد مہمانوں کو بلایا کرتا ہے کہ آئیے اب کھانا تناول فرمائیے اس طرح تم اقوام عالم کے لیے لقمہ تر ہوجاؤ گا''۔

صحابہ نے بڑے تعجب کے ساتھ سوال کیا:

اَمِنْ قِلَّۃٍ نَحْنُ یَوْمَئِذٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

''حضور! کیا یہ اس لیے ہوگا کہ ہماری تعداد بہت کم ہوجائے گی''۔

حضور ﷺ نے فرمایا نہیں: بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ ''یعنی نام کے مسلمان تو بہت ہوں گے تمہاری تعداد تو بہت ہوگی تمہاری حیثیت سیلاب کے اوپر جھاگ کے مانند ہوکر رہ جائے گی'' اس پر پھر سوال کیا گیا کہ ''ایسا کیوں ہوگا تو آپ ؐ نے فرمایا کہ ''تمہارے اندر ایک بیماری پیدا ہوجائے گی جس کا نام ''وَھْن'' ہے پھر سوال ہوا۔تو آپ ؐ نے جواباً ارشاد فرمایا: مَا الْوَھْنُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ؟ تو آپ ؐ نے جواباً ارشاد فرمایا:

حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ

''دنیا کی محبت اور موت سے کراہت''

یہ نقشہ جو ہمیں اس حدیث نبوی ؐ میں نظر آتا ہے اس موجودہ صدی کے بالکل آغاز میں عالمِ اسلام میں بچشمِ سر دیکھا گیا ہے ٔ وہ وقت تھا جب ایک دلِ دردمند کی یہ صدا سننے

میں آئی تھی۔ مولانا حالی نے مسدس کی پیشانی پر جو شعر لکھے ہیں۔ وہ اسی صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہیں:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ۔۔۔ اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد ۔۔۔ دریا کو ہمارے جو اترنا دیکھے

اور خاتمے پر جو مناجات ہے۔ بحضور سرورِ دو عالم ﷺ اس کا آغاز ان اشعار سے ہوا۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے ۔۔۔ اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دین جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے ۔۔۔ پردیس میں آج غریب الغربا ہے

یہ تھا نقشہ اس صدی کے آغاز میں۔ البتہ یہ بات نوٹ کر لینے کی ہے کہ اس کے بعد نصف صدی بیت چکی ہے بلکہ اس سے بھی زائد۔ اس کے دوران ایک دوہرا عمل ہمارے سامنے آیا ہے۔ ایک طرف ہمارے انحطاط اور زوال و اضمحلال کے سائے اور گہرے ہوتے چلے گئے، بیت المقدس دوسری مرتبہ ہمارے ہاتھ سے چھنا اور آج چودھواں برس جا رہا ہے کہ وہ ایک مغضوب علیہم قوم کے قبضے میں ہے، سقوطِ ڈھاکہ اور عرب اسرائیل جنگوں میں جو عربوں کو شکستیں ہوئیں۔ یہ عذابِ الٰہی کے کوڑے ہیں جو ہماری پیٹھ پر برس رہے ہیں لیکن دوسری طرف ایک احیاء و تجدید کی تحریک (up ward movement) بھی شروع ہو چکی ہے۔ ایک احیائی عمل کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ اس کے پہلے مرحلے (phase) سے بحمد اللہ اور بفضلہٖ تعالیٰ امت مسلمہ کسی حد تک گزر بھی چکی ہے۔ چنانچہ پورے عالم اسلام سے مغربی استعمار کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس سیلاب کا رخ موڑا جا چکا ہے۔ سیاسی اعتبار سے پورا عالمِ اسلام تقریباً آزادی حاصل کر چکا ہے اگرچہ ذہنی غلامی ابھی باقی ہے تہذیبی علمی اور فنی غلامی ابھی برقرار ہے۔

بایں ہمہ یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے کہ سیاسی طور پر عالمِ اسلام کی عظیم اکثریت آزادی سے ہمکنار ہو چکی ہے۔ تاہم اصل کام ابھی باقی ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

وہ کام جو محمد رسول اللہ ﷺ اُمت کے حوالے فرما کر گئے تھے وہ امانت جو آپؐ کی ہمارے پاس ہے وہ فرضِ منصبی جو بحیثیت اُمت ہمارے کاندھوں پر ہے وہ فرض جب محمد رسول اللہ ﷺ کے کاندھے پر آیا تھا تو وحی آسمانی نے پیشگی طور پر فرما دیا تھا کہ:

﴿اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا﴾ (المزمل)

''اے محمدؐ! ہم آپؐ پر ایک بڑی بات ڈالنے والے ہیں''۔

وہ بھاری بوجھ ہے جو اُمت مسلمہ کے کاندھے پر ہے۔ یہ امت پیغامِ محمدی کی امین ہے، یہ دین خداوندی کی علمبردار ہے، اس کے ذمہ ہے اس پیغام کو پہنچانا پوری نوعِ انسانی تک۔ اس کے ذمے ہے، اس دین کو قائم اور نافذ کرنا اور پھر نوعِ انسانی کو اس نظامِ عدلِ اجتماعی سے روشناس کرانا جو محمد رسول اللہ ﷺ لے کر اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ یہ ہے، ہمارا فرض منصبی یہ ہیں ہماری ذمہ داریاں۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں ہمارا عروج اور ہماری عزت و وقار کا معاملہ دوسری قوموں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ہم دنیا میں معزز اور سربلند اُس وقت تک نہیں ہو سکتے ہیں جب تک ہم اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے محنت، سعی و کوشش اور جدوجہد نہ کریں۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

گویا ہمارے عروج و زوال کا معاملہ دنیا کی عام قوموں کے عروج و زوال کے اسباب سے بالکل جدا ہے۔ ہمارے ذمے جو فرض منصبی ہے اگر اس کو ادا کریں گے تو تائید خداوندی ہمارا ساتھ دے گی۔ بقول علامہ اقبال۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

فَصَلَّی اللّٰهُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

نبی اکرمؐ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں
اور
نبویؐ مشن کی تکمیل اور ہمارا فرض

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ١٥٧﴾ (الاعراف)

''پس جو لوگ ایمان لائے ان (نبی اکرمؐ) پر اور جنہوں نے ان کی توقیر و تعظیم کی اور جذبۂ احترام کے ساتھ جنہوں نے انؐ کی مدد و حمایت کی' اُن کے کام اور ان کے مشن میں اُنؐ کے دست و بازو بنے اور انؐ کے فرضِ منصبی کی تکمیل میں اپنی قوتوں' صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا اور جنہوں نے اس نور کا اتباع کیا۔ پیروی کی جو اُنؐ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے یعنی قرآن مجید۔ تو یہی لوگ ہیں جو خدا کے ہاں فلاح پانے والے کامیاب و کامران اور شادکام ہونے والے قرار پائیں گے''۔

قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ: قُلْنَا لِمَنْ: قَالَ لِلّٰهِ وَلِكِتٰبِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ (مسلم)

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ الْكَرِيْمُ

اُمت مسلمہ اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہے اُس کی تفصیل میں جانے کی چنداں احتیاج نہیں ہے۔ ہر صاحبِ نظر آگاہ ہے کہ عزت اور وقار اور سربلندی گویا کہ ہم سے چھین لی گئی ہے اور اللہ تعالیٰ معاف فرمائے واقعہ یہ ہے کہ جو مغضوب علیہم قوموں کا نقشہ قرآن مجید میں کھینچا گیا ہے۔ مختلف اعتبارات سے وہی نقشہ آج ہمیں

اپنے اوپر منطبق ہوتا نظر آ رہا ہے۔ افتراق ہے' باہمی خانہ جنگیاں ہیں' اختلافات ہیں۔ وحدت اُمت جو مطلوب ہے تو اس کا شیرازہ پارہ پارہ ہو چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا حل کیا ہے؟ اس کے لیے ہم کس طرف رجوع کریں؟ اس کا جواب اگر ایک لفظ میں جاننا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ خلوص اور اخلاص کا رشتہ اور وفاداری کا تعلق از سر نو اللہ سے اس کی کتاب سے اور اس کے رسول ﷺ سے استوار کیا جائے اور صحیح بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ ابھی جو حدیث میں نے آپ کو سنائی اس کی رو سے نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمایا:

''دین تو بس خیر خواہی اور خلوص اور اخلاص اور وفاداری کا نام ہے۔ پوچھا گیا کہ حضور' کس کی وفاداری کس سے خلوص و اخلاص؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا! اللہ سے اس کی کتاب سے اور اس کے رسولؐ سے اور مسلمانوں کے رہنماؤں اور قائدین سے اور عامۃ المسلمین سے''۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلوص و اخلاص کا جہاں تک تعلق ہے تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے وہ ایک لفظ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ التزامِ توحید اور شرک سے اجتناب شرک کی ہر نوعیت سے ہر شائبے سے اپنے آپ کو پاک کر لیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وفاداری ہے۔ اگرچہ کام آسان نہیں بقول علامہ اقبال مرحوم

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

جہاں تک قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خلوص و اخلاص کا معاملہ ہے تو یہ درحقیقت دو چیزیں نہیں ایک ہی ہیں۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ قرآنِ مجسم ہیں۔ قرآن حکیم مصحف ہے' قرآن متلو ہے اور آنحضور ﷺ قرآنِ مجسم ہیں جیسے کہ فرمایا اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب اُن سے یہ فرمائش کی گئی کہ ہمیں حضور ﷺ کی سیرت بتایئے تو آپؓ نے سوال کیا کیا تم قرآن نہیں پڑھتے اور جب جواب اثبات میں آیا تو آپؓ نے فرمایا: كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ ''حضور ﷺ کی سیرت قرآن ہی تو ہے''۔

اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ خلوص و اخلاص کے تقاضے کیا ہیں۔ آنحضور ﷺ کے ساتھ ہماری وہ نسبت کیسے قائم ہوسکتی ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے سادہ ترین الفاظ میں تو یوں کہا کہ:

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اور بڑے پرشکوہ انداز میں کہا:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں چار ہیں۔
آج جو آیت تلاوت کی گئی اس کا پس منظر بڑا عجیب ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اپنے اور اپنی قوم کے لیے بارگاہِ خداوندی میں رحمت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے جواباً ارشاد فرمایا: میری ایک رحمت تو عام ہے جو تمام مخلوقات کے لیے کھلی ہوئی ہے اور جو میری رحمتِ خصوصی ہے تو اُسے میں نے مخصوص کر دیا ہے اُن لوگوں کے لیے جو میرے نبی اُمی سے اپنا صحیح تعلق قائم کریں گے وہ تعلق کیا ہے؟ اس کو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کے آخری حصے میں ان الفاظِ مبارکہ میں بیان کر دیا۔ جس کی میں نے آغازِ کلام میں تلاوت کی تھی کہ:

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الاعراف)

''جو لوگ اُن پر ایمان لائیں گے ان کی تعظیم کریں گے ان کی نصرت و حمایت کریں گے اور جو نور اُن کے ساتھ نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کریں گے وہ ہوں گے اصل معنی میں کامیاب اور میری رحمتِ خصوصی انہی لوگوں کے حصے میں آئے گی''۔

اس آیۂ مبارکہ کی روشنی میں غور کیا جائے تو حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی

چار بنیادیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

سب سے پہلی بنیاد ہے تصدیق و ایمان۔ یہ تصدیق کرنا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آپؐ نے جو کچھ فرمایا اپنی طرف سے نہیں فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو وحی فرمایا اُسی کو نوعِ انسانی کے سامنے پیش فرمایا:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم)

''اور ہمارا نبیؐ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر کی جاتی ہے۔''

اب اس ضمن میں یہ جاننا چاہیے کہ اس ایمان اور تصدیق کے دو درجے ہیں ایک اقرارٌ باللسان کا درجہ ہے۔ زبانی اقرار۔ اس سے انسان اسلام کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ قانونی ضرورت پوری ہو جاتی ہے جو اُمت محمد عَلٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں شامل ہونے کے لیے لازمی اور ضروری ہے لیکن اصلی ایمان ''تصدیق بالقلب'' کا نام ہے جبکہ آنحضور ﷺ کی رسالت پر آپؐ کی نبوت پر دل میں یقین کی کیفیت پیدا ہو جائے تو یہ ہے ایمان مطلوب۔ اس کے بغیر جو دوسرے حقوق ہیں نبی اکرم ﷺ کے وہ ہم ادا نہیں کر سکتے پھر زبانی کلامی تعلق رہے گا جیسے کہ اللہ معاف فرمائے ہماری ایک عظیم اکثریت کا فی الواقع ہے۔

دوسرا تعلق ہے تعظیم و محبت۔ یہ لازمی تقاضا ہے یقین قلبی کا۔ اگر یہ یقین ہو کہ آپؐ اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں تو آپؐ کی ایک عظمت کا نقش قلب پر قائم ہوگا۔ آپ کی محبت دل میں جاگزیں ہوگی جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا' جب تک میں اُسے محبوب تر نہ ہو جاؤں اُس کے اپنے بیٹے سے' اس کے اپنے باپ سے اور تمام انسانوں سے''۔

یعنی اگر ایک مؤمن کے دل میں آنحضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزہ و اقارب اور تمام انسانوں سے بڑھ کر جاگزیں ہوئی ہے تو وہ حقیقتاً مؤمن ہے۔ اس حدیث میں 'بیٹے اور

باپ‘ کے ذکر نے تمام عزیزوں‘ رشتہ داروں‘ قبیلوں اور قوموں کا احاطہ کر لیا ہے۔ ان الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ ایسا نہیں کہ بات واضح نہ ہو بلکہ صاف صاف اور دوٹوک انداز سے ارشاد ہوا کہ حقیقی ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ حضور ﷺ ایک بندۂ مؤمن کو دنیا کی تمام چیزوں سے محبوب تر ہو جائیں۔

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

تعظیم ظاہری بھی مطلوب ہے اور قلبی بھی اسی طرح محبت کا زبانی بھی اظہار ہو اور دل میں بھی جاگزیں ہو اور اس کا سب سے بڑا مظہر ہے حضور ﷺ پر درود بھیجنا۔ جس کے بارے میں یہ بھی فرمایا گیا کہ اگر کوئی شخص اپنی دعا کل کی کُل صرف حضور ﷺ پر درود بھیجنے پر مشتمل کر دے تو اس کا مقام اور مرتبہ کہیں زیادہ ہوگا اس سے کہ وہ خود اللہ سے اپنے لیے کوئی سوالات کرتا رہے۔

تیسرا تعلق حضور ﷺ کے ساتھ ہمارا حضور ﷺ کی نصرت وحمایت ہے جو لازمی نتیجہ ہے ان پہلی دونوں بنیادوں کا۔ وہ ہے آنحضور ﷺ کی اطاعت اور آپؐ کا اتباع۔ ظاہر بات ہے جب آپ کو اللہ کا رسول مانا تو اب آپؐ کے حکم سے سرتابی چہ معنی دارد آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر ہوگا۔ اس میں تو البتہ انسان تحقیق کا حق رکھتا ہے کہ واقعتاً محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا ہے یا نہیں۔ لیکن جب طے ہو جائے کہ یہ آپ کا فرمان ہے‘ یہ آپ کا حکم ہے تو اب چون و چرا کا کوئی سوال نہیں اب تو اطاعت کرنی ہوگی اور اطاعت بھی کیسی! وہ اطاعت جس کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵﴾ (النساء)

’’پس نہیں تیرے ربّ کی قسم! یہ لوگ ہرگز مؤمن نہیں ہیں جب تک اپنے نزاعات میں آپ ہی کو حکم نہ مانیں اور جو کچھ آپ فیصلہ فرمائیں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ آپؐ کے فیصلے کے آگے دل کی پوری آمادگی

اور خوشی کے ساتھ سرِ تسلیم خم نہ کر دیں‘‘۔

یہی بات آنحضور ﷺ نے فرمائی:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))

’’تم سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس اس ہدایت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں‘‘۔

جب اطاعت کے ساتھ محبت کی شیرینی شامل ہو جائے تو اس طرزِ عمل کا نام ہے ’’اتباع‘‘۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ظاہر ہے کہ اطاعت تو ان احکام کی ہوگی جو حضور ﷺ نے دیئے ہوں۔ لیکن اتباع ان تمام اعمال وافعال کا ہوگا جن کا صدور وظہور ہوا نبی اکرم ﷺ سے۔ چاہے اس کو کرنے کا حکم آپ نے بالفعل نہ دیا ہو۔ اس اتباع کا قرآن مجید میں جو مقام ہے وہ بھی سن لیجیے۔ سورۃ آل عمران (آیت ۳۱) میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ﴾

’’اے نبیؐ! ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں کو ڈھانپ لے گا‘‘۔

اس آیت کریمہ سے اتباعِ رسول کی یہ اہمیت سامنے آتی ہے کہ اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے تو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا اتباع لازم ولابد ہے۔ اسی اتباع کا ایک نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ اللہ ہم سے محبت فرمائے گا اور دوسرا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اس کی مغفرت وعفو کے مستحق قرار پائیں گے۔ اس سے زیادہ ایک بندۂ مؤمن کی خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کا محبوب اور اس کی مغفرت کا سزاوار بن جائے۔

چوتھا اور آخری اور یوں کہیے کہ یہ عروج ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کا وہ ہے تائید ونصرت۔ حضور ﷺ ایک مشن لے کر تشریف لائے تھے۔ حضور ﷺ کا مقصد بعثت عالمی سطح پر ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دورانِ خلافتِ راشدہ اس عمل کو جہاں تک پہنچایا تھا ہم اپنی بے عملیوں کے طفیل وہ اثرات بھی ختم کر چکے ہیں۔ اب تو از سرِ نو پیغامِ محمدیؐ کی نشر و اشاعت کرنی ہے۔ پیغامِ محمدیؐ کو پہنچانا ہے تمام اقوام و مللِ عالم تک اور از سرِ نو اللہ کے دین کو فی الواقع قائم اور نافذ اور غالب کرنا ہے۔ پورے کرۂ ارضی پر اور اس کے لیے پہلے جہاں بھی اللہ توفیق دے جس خطۂ ارضی کی قسمت جاگے کہ وہ سب سے پہلا base قرار پائے اس عہدِ حاضر میں انقلابِ محمدیؐ کا تو اس ملک کی خوش بختی اور خوش نصیبی پر تو واقعتاً رشک کیا جانا چاہیے۔

یہ ہے وہ فریضۂ منصبی جو اُمت کے حوالے کیا گیا ہے۔ آنحضورﷺ کا مشن زندہ و تابندہ ہے۔ حضورﷺ گویا کہ اب بھی پکار رہے ہیں:

﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰهِ﴾

''کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں''

یعنی کون ہے جو میرے پیغام کی نشر و اشاعت کا کام کرے۔ میرے دین کا علمبردار بن کر کھڑا ہو اور پورے کرۂ ارضی پر اس کا جھنڈا سربلند کرنے کے لیے تن من دھن لگانے کے لیے آمادہ ہو جائے۔

اسی کے ضمن میں آخری بات آتی ہے اس آیۂ مبارکہ میں کہ اس عمل کا ذریعہ کیا ہے؟ محمد رسول اللہﷺ نے جو انقلاب برپا کیا تو آلۂ انقلاب تھا قرآن حکیم۔

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعة:٢)

''وہی اللہ ہے جس نے اُمیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے۔ ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے''۔

پس معلوم ہوا کہ آپؐ کی دعوت کا مرکز و محور قرآن حکیم تھا۔ آپؐ نے لوگوں کی ذہنیتیں بدلیں تو اسی قرآن حکیم سے۔ لوگوں کی سوچ میں انقلاب برپا کیا تو اسی قرآن حکیم سے، ذہن کی تطہیر فرمائی تو اسی قرآن کی آیاتِ بینات سے، تزکیۂ نفس فرمایا تو اسی قرآن کی آیاتِ بینات اُس کا ذریعہ بنیں، خارج و باطن منور ہوئے تو اسی قرآن حکیم کے نور سے۔

وہ کتاب موجود ہے اور اسی کے اتباع کا ان الفاظِ مبارکہ میں ذکر ہوا:

﴿وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ﴾

''اور اس نور کا اتباع کیا جو ان (نبی) کے ساتھ اتارا گیا ہے''۔

وہ نور جو آپ کے ساتھ نازل کیا گیا (ﷺ)۔ وہ نور حضورﷺ حوالے کر کے گئے۔ وہ امت کے پاس محفوظ ہے۔ اس کے ساتھ اپنے تعلق کو درست کرنا ہے یہ آنحضورﷺ کے ساتھ ہمارے صحیح تعلق کی آخری اور اہم ترین بنیاد ہے۔ یہ وراثتِ محمدیؐ ہے اُس کو مضبوطی سے تھامنے کا ہم کو حکم ہے اور اسی کو حبل اللہ قرار دیا گیا ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾

یہی کتاب اللہ امت کے اندر از سرِ نو اتحاد اور یک جہتی پیدا کرے گی، اسی سے وحدتِ فکر پیدا ہو گی، اسی سے وحدتِ عمل پیدا ہو گا، اس سے ہماری جدوجہد، یک جہتی کے ساتھ اپنے اصل ہدف کی طرف آگے بڑھے گی۔ اس کتاب کے حقوق کو پہچاننا بھی ہمارے ایمان اور وقت کی ایک عظیم ضرورت ہے۔ جیسے نبی اکرمﷺ کے ساتھ اپنے تعلق کی بنیادوں کو پہچاننا ہمارے حقیقی و قلبی ایمان کے لیے ضروری و لابدی ہے۔ یہی درحقیقت میلاد النبیؐ کا اصل پیغام ہے۔ یہی اصل لمحۂ فکریہ ہے۔ اس کو از سرِ نو سمجھیں اور محمد رسول اللہﷺ اور آنحضورﷺ کی لائی ہوئی کتاب مبارک کے ساتھ اپنی نسبت کو پوری درستگی کے ساتھ بہ تمام و کمال از سرِ نو استوار کر لیں۔ اس کتاب کو مانیں جیسا کہ اس کے ماننے کا حق ہے۔ اسے پڑھیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے اس کو سمجھیں جیسا کہ اس کو سمجھنے کا حق ہے، اس پر عمل کریں جیسا کہ اس پر عمل کا حق ہے اور پھر اُس کے مبلغ،

داعی اور معلم بن جائیں جیسے کہ اُس کی تبلیغ، دعوت، تعلیم اور تبیین کا حق ہے۔ **وفقنا اللّٰہ لھذا!**

اللہ تعالیٰ ہمیں ان جملہ امور پر عمل کی توفیق عطا فرمائے تا کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے مشن کی عالمی سطح پر تکمیل کے لیے راست سمت میں پیش قدمی کر سکیں۔ اور وہ وقت آئے جس کے بارے میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا تھا کہ ''جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب اور قائم ہو جائے گا جیسے محمد عربی ﷺ نے اپنے عہد مبارک میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب کر دیا تھا تو وہ وقت ہو گا جب یہ آیۂ مبارکہ اپنی پوری شان کے ساتھ ظاہر ہو گی:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾

فَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**